سہ ماہی

کاروانِ ادب لکھنؤ

قوتِ بیان اور ادب

”قوتِ بیان کیا ہے؟ وہ کسی معاملہ میں اپنے احساس یا رائے سے دوسرے کو واقف کرانے کی صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کو جب سلیقے سے عمل میں لایا جاتا ہے تو خاصی مؤثر ثابت ہوتی ہے، اور بعض وقت اس کے اثر سے مخاطب کے رجحانات، میلانات اور احساسات میں تبدیلی بھی آجاتی ہے۔ نطق وکلام کو مناسب ڈھنگ اور مخاطب کے فہم وادراک کی رعایت کے ساتھ جب استعمال کیا جاتا ہے تو اس کلام کو ”ادب“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔“

(حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ)

رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سہ ماہی

کاروانِ ادب لکھنؤ

جلد نمبر ۲۹ | جولائی تا ستمبر ۲۰۲۶ | شمارہ نمبر ۲

مشرف عام: مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (صدر رابطہ ادب اسلامی)

مجلس مشاورت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی (نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی) ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)
ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی ندوی (دہلی) مولانا محمد علاء الدین ندوی (صدر شعبہ عربی، دارالعلوم ندوۃ العلماء)
مولانا اقبال احمد ندوی (وکیل کلیۃ اللغۃ العربیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ بھٹکل، کرناٹک)

مدیر تحریر: ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی
نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق ندوی
معاون ادارت: محمد نفیس خان ندوی

معاون انتظامی
مشہود السلام ندوی
ڈاکٹر محمد وثیق ندوی

مجلس ادارت

نعیم الرحمن صدیقی ندوی انیس احمد ندوی عبدالرحیم ندوی
محمد سمعان خلیفہ ندوی شاہ اجمل فاروق ندوی

رابطہ ادب اسلامی لکھنؤ (انڈیا)

فی شمارہ/50 روپئے
سالانہ 200/ روپئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آئینۂ مضامین

متاعِ گم گشتہ کی بازیابی (اداریہ)	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۳--
اسلامی ادب کیا ہے؟	مولانا محمد علاء الدین ندوی	۶--
اسلوبِ قرآنی وارشادِ رحمانی	مولانا اقبال احمد ندوی	۱۲--
مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ایک نادر عربی مرثیہ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۲۰--
سرگوشی	محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۲۴--
برمحل نیز ضرب المثل اشعار	مولانا انیس احمد ندوی	۳۰--
حسن دل ربا	مولانا عبدالرحیم ندوی	۴۳--
سیرت النبیؐ از علامہ شبلی نعمانیؒ	مولانا ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی	۴۷--
نغمۂ شوق کی ایک داستان	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۶۰--
مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کا ادبی ذوق	شاہ اجمل فاروق ندوی	۶۲--
مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی نعتیہ شاعری	محترمہ ام ہانی	۷۰--
طوفان سے ساحل تک	محمد نفیس خان ندوی	۷۴--
دعوت نامہ برائے سیمینار رابطہ ادب اسلامی	ادارہ	۷۸--

متاعِ گم گشتہ کی بازیابی

﴿عمیر الصدیق دریابادی ندوی﴾

کاروان ادب کے غبار پس کارواں میں ایک وجود قریب سوا سو سال پہلے رسالہ الندوہ کا بھی نظر آتا ہے۔ اس رسالہ کی علمی و تحقیقی اور ادبی تاریخ سے اہل علم خوب واقف ہیں۔ معترف بھی ہیں اسی لیے جب اور جہاں اردو کے ادب عالیہ کا ذکر آتا ہے تو رسالہ الندوہ کا نام بھی زبان پر آجاتا ہے۔ اس کے اولین شماروں کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا کہ یہ مجلس ندوۃ العلماء کا ماہوار علمی رسالہ ہے جس کا مقصد، علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ وجدیدہ کا موازنہ ہے۔ سرورق کی اس عبارت کی تشریح و تفصیل اس رسالہ کی ایک ایک سطر سے ہوتی تھی۔ عنوانات خواہ تمدن و ترقی، فلسفہ یونان، نصاب تعلیم وغیرہ جیسے موضوعات کی نشان دہی کرتے رہے ہوں لیکن رسالہ کی سب سے نمایاں خوبی، اس کے مضامین کا ادبی اسلوب تھا۔ جو خشک سے خشک مضامین و مطالب کو اس درجہ شستہ اور شگفتہ بنا دیتا کہ پڑھنے کے لیے فلسفہ یونان کی بحث بھی دلچسپی کا سبب بن جاتی اور اس کی ایک وجہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی ادارتی ذمہ داری تھی۔ علامہ شبلی تعارف سے مستغنی ہیں۔ شروانی صاحب کے تعارف میں بھی سب سے پہلی خوبی ان کی ادبی شان و شناخت ہے۔ مولانا شروانی کی صحیح معرفت کے لیے ان کا حبیب شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا مکتوب الیہ ہونا اور پھر صدر یار جنگ کے نام سے ان کے سوانح پر مشتمل کتاب کا ہونا کافی ہے۔ ایک نہایت شائستہ علمی مذاق و مزاج کے انسان تھے۔

اپنے حالات میں انھوں نے اپنے گھر اور ماحول کی علمی فضا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ان کے والد مرحوم کو ادب اردو اور تاریخ فارسی کا ذوق تھا۔ گھر کے ادبی ماحول کا اثر یہ ہوا کہ مولانا شروانی نے بھی سب سے پہلے جس کتاب کو پڑھا وہ مرزا غالب کی اردوئے معلیٰ تھی، عمر کی ابتدا تھی، پوری طرح سمجھنے میں نہیں آتی تھی لیکن اس کو دیکھے جاتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ذوق ذرا ہوشیار ہوا تو پھر غالب کی انشاء عود ہندی پڑھی اور خوب پڑھی اور پھر مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات نے گویا ان کے علم کو ادب کے زیور سے آراستہ کر دیا۔

یہ حقیقت دہرائی جاتی رہی ہے کہ علم کا زیور ادب ہے۔ لیکن یہ تصور بھی کچھ ذہنوں میں اپنی جگہ بناتا رہا کہ علم یا اصل الفاظ میں رائج الوقت قدیم درسی نصاب سے شعروادب کا ذوق لطیف نہیں پیدا ہوتا۔ ایک بزرگ مولانا سید طلحہ حسنی تھے، عالم، فاضل، قرآنیات اور تاریخ اسلام کے ساتھ صرف ونحو ونجوم کے بھی ماہر تھے، وہ لکھتے ہیں کہ لوگوں کو کہتے سنا کرتا تھا کہ مولوی شعر کیا جانیں 'شعر من بمدرسہ کہ برد' مشہور بات ہے لیکن طلحہ صاحب نے آب حیات، تذکرہ گلشن بے خار، گل رعنا، مقدمہ شعروشاعری اور شعرالعجم کا ذکر کیا جو علماء کے قلم سے تھیں اور یہ کہا کہ شعرالعجم تو مجتہدانہ طرز کی کتاب ہے۔ اس اعتراف کا مقصد شاید یہی تھا کہ علماء یا یوں کہئے کہ اہل مدرسہ ہی نے بنیادی ادبی کتابوں کو وجود بخشا اور اپنے ذوق سخن شناسی سے ادب کی واقعتاً علم کے زیور سے آرائش کی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تو واضح طور پر اس سچائی کا اظہار کیا کہ ۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک، ادبی وعلمی محفلوں میں یہی اہل مدرسہ تھے، قدیم نصاب کے ساختہ پرداختہ جو زبان وادب کی سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے تھے۔ نکتہ شناسی اور دیدہ وری میں ان کا معیار اتنا بلند تھا کہ زبان وادب میں بھی ان کا قول حرف آخر اور ''فتویٰ'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ علماء کے ہاتھ میں ملک کی علمی وادبی قیادت رہی۔ مدارس کے جو قدیم تعلیم یافتہ تھے ان کے ادبی ذوق کی بلندی کی حد نہ تھی۔ محسن کاکوروی، نہ آزاد نہ حالی نہ شبلی نہ حکیم عبدالحی، مگر ان کے متعلق کہا گیا کہ ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہوجاتا ہے، ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔ ان ہی محسن کاکوروی کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا کہ ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں، وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات واستعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح انیس ودبیر سے کم نہیں۔ انیس ودبیر کے اس موازنہ کی وجہ اصلاً تو آب حیات کے جانب دارانہ رویہ کی جانب اشارہ کرنا تھا مگر اس تجزیہ سے مولانا علی میاں کی ایک عالم ہی نہیں بلکہ ایک صاحب نظر ادیب ونقاد کی گہرائی وگیرائی کی بھی شہادت ملتی ہے۔ یہی حال گل رعنا کے مصنف ومولف کا ہے کہ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کے بعد مولانا حکیم عبدالحی حسنی کو ایسی کام کی باتیں ہاتھ آئیں جو آنکھوں سے لگانے اور دل میں بسانے کے لائق بن گئیں۔

ادھر ادھر کی ان باتوں کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ادب اور علم کے رشتوں کی روح کو تلاش کیا جائے اور اس خیال خام کی ناطاقتی کو سامنے لایا جائے کہ ادب و شعر و تنقید کو مدرسہ اور مدرسہ والوں سے مس نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ علم و ادب کی ترقی ہر زبان و ادب اور ہر ملک و ملت میں ان سب کی رہین منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا۔ اس قبول حق کی صداقت کو دوام بخشنا ہے تو علم و ادب کے باہمی رشتوں پر اہل مدرسہ کو نگاہ رکھنی ہوگی۔ اسلام کے پیغام کے ساتھ پاکیزہ اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کی پرورش اور یہاں یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ کتاب خوانی کی عادت اب ظاہری رسم بھی نہیں رہی۔ کبھی حال یہ تھا کہ مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے۔ اب اچھے لکھنے والوں کے ساتھ کتب خانے اور کتب فروش مرثیہ خواں ہیں کہ کتاب خواں نہ رہے۔ ہمارے ایک مفکر ادیب نے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا کہ اس اردو ملت کا کیا حال اور کیا مآل ہونے والا ہے۔ نہ کتاب بیں نہ کتاب خواں نہ صاحب کتاب۔ کہاں سے فکر و فن اور نظریہ و خیال کی جمالیات کی کرنیں دل و دماغ میں چمکیں گی۔ علم و عمل کی دنیا میں لازوال نقوش قائم کرنے والوں کی یہ نسلیں آخر اپنی زبان کی پاکیزگی اور خیالات کی بلندی کو جاننے اور دوسروں کو واقف کرانے کی ذمہ داری سے روگرداں کیوں ہوگئیں۔ زبان کا معیار، اسلوب کی انفرادیت، مضامین کی شائستگی، الفاظ کا انتخاب، ذوق کی بلندی، کیا اردو زبان کی شاندار علمی وراثت اس تمام سرمایہ سے تہی دست ہونے کے احساس سے بھی عاری ہوگئی۔ سوال ہیں اور بہت ہیں؟ جواب کہاں سے ملے؟!

نومبر کے مہینے میں اسی جواب کی مسلسل تلاش میں رابطہ ادب اسلامی کے وابستگان، علم و ادب کے ایک سرسبز شاداب اور آباد جزیرہ بھٹکل میں جمع ہوں گے۔ گفتگو کا بظاہر خاص مرکز ایک نہایت پاکیزہ خیال اور پاکیزہ قلم شخصیت مولانا واضح رشید ندویؒ کی علمی و ادبی و فکری زندگی کا مطالعہ ہے لیکن اس کا اصل مقصد اس متاع گم گشتہ کی بازیابی ہے جس کی وجہ سے علماء اور راسخین علم کی ادبی سلطنت اردو دنیا میں قائم ہوئی اور قائم رہی۔ اردو دنیا میں ادبی نوآبادیت اور سامراجیت نے الگ الگ وقتوں میں ریاستیں ضرور قائم کیں۔ مگر وہ اس دنیا کو جذبہ و شعور کی وہ دولت نہیں دے سکی جس سے کوئی بھی اقلیم، حقیقتاً سرمایہ دار ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ بھٹکل کے مذاکرہ علمی کا انتظار اسی جذبے سے کیا جانا چاہیے کہ ادبی روح اور ادبی زیور سے آراستہ علم کی دنیا ہی دراصل انسان اور حیوان کی پہچان ہے۔

اسلامی ادب کیا ہے؟

مولانا محمد علاء الدین ندوی – صدر شعبہ عربی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

فن برائے فن کا نظریہ

فن برائے فن کا نظریہ اُن ادیبوں اور مفکروں کا نظریہ ہوسکتا ہے جو خود زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھتے ہوں، آخر دنیا میں کوئی عقلمند انسان ایسا بھی ہوسکتا ہے کیا جو اپنی زندگی کا کوئی بھی مقصد اور مطمح نظر نہ رکھتا ہو۔ ادب برائے ادب کے تصور سے سماج کو لذت کوشی، جنسی انارکی، گھٹیا رومانس پر مبنی ادب، سوقیانہ اشعار، گل و بلبل کی داستاں، طلسم ہوش ربا، لیلی مجنون کے قصے، شیریں فرہاد کے من گڑھت واقعات اور وقت گزاری کے لئے داغ دار اور غیر مقصدی ادب پیش کیا جاتا رہا۔

ادب برائے زندگی اپنے وسیع تر تصور میں تو یقیناً بڑی کشش ہے اور ہم اس کے طرفدار بھی ہیں، مگر تخلیق کار خدا بیزار ہو تو اس کی پوری تخلیق تصور خدا سے عاری ہو گی اور اس کا شعر و ادب بھی روزی روٹی، کپڑا لتّا اور مکان کی گردان ایک بنیے کا روزنامچہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اسلامی ادب ایک نظریاتی ادب ہے

اسلامی ادب بھی نظریاتی ادب ہے، وہ اخلاقی اقدار کا پابند ہوتا ہے، وہ ایک مقصدی اور انسانی ادب کا پاسباں ہوتا ہے۔ اسلامی ادب اسلامی تصور کی زرخیز زمین پر اُگتا ہے، وہ انسان اور ماورائے انسان، وہ مکان اور لامکاں کو بھی موضوع بحث بناتا ہے اور ادیب اپنی کیفیات و تخیلات کو فنی صداقت اور حسین لفظوں کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ اسلام کے مثبت، فطری اور رجائی نظریہ حیات کی عکاسی کرتا ہے، وہ انسان کو اپنے مقصد تخلیق کو سمجھنے اور اپنے آپ کو ایک کار آمد فرد بننے میں مدد دیتا ہے، وہ انسانی معاشرے کو صالح اقدار پر تشکیل دینے کے لئے اپنے فن کی خدمات پیش کرتا ہے۔

اسلامی ادب مقصدی اور تعمیری ہوتا ہے

اسلامی ادب وہ مقصدی و تعمیری ادب ہوتا ہے، جو انسان کو خدا بے زار اور ادب کو خدا بے زاری کی راہ پر ہرگز نہیں ڈال سکتا۔ اسلامی ادب زندگی کو وسیع کینوس فراہم کرتا ہے، وہ ادب کو مقصد نہیں وسیلہ سمجھتا ہے، وہ اسلامی مفاہیم و مبادیات، اسلامی تصورات و افکار اور انمٹ اصول و اقدار کی پوری حمایت کرتا ہے۔ وہ ادبی حسن و جمال اور فنی نزاکتوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے، ایسا ہی ادب دلوں کو گرماتا ہے، روح کو تڑپاتا ہے، جذبات کو صحیح رخ دیتا ہے اور انسانی دردمندی کے بیج بوتا ہے۔

ہر اسلامی مضمون اسلامی ادب نہیں ہوتا

مگر ہر مضمون جو 'اسلامی' ہو وہ 'اسلامی ادب' نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں فنی صداقت، شعوری تجربہ، نادر خیال، فکری بلندی اور دل کش اسلوبِ بیان ہوگا، ایسا ہی نمونہ اسلامی ادب کے خانہ میں جگہ پائے گا۔ اسلامی ادیب کا اسلوب بیان کسی واعظ یا مدرس کا اسلوب بیان نہیں ہو سکتا، نہ ہی یہاں کسی مبلغ و مصلح کی طرح ڈائریکٹ میتھڈ سے کام لینے کی گنجائش رہتی ہے۔

آج کے ادب کو کارِ زیاں کیوں سمجھا جاتا ہے؟

ہاں یہ صحیح ہے کہ آج زندگی کی دوڑ میں معاشی دباؤ، حرص و ہوس اور پروفیشنل کامیابی کی سوچ نے ادب کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔

یہ دور مادیت ہے، اور اس کی قیادت مغربی تہذیب کر رہی ہے جو پورے طور پر الحاد میں غرق ہے، آج کا تعلیمی نظام ایسی سوچ کا انسان پیدا کر رہا ہے جہاں ادب جیسے روحانی خدمت گار کے لیے انسان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے اور ہے بھی تو کمتر اور نا قابل التفات۔ اس کے متعدد اسباب و وجوہات بیان کیے جا سکتے ہیں، مثلاً ادب کا مطالعہ طویل وقت کے ساتھ ساتھ ذوق، لگن اور سعی و کوشش چاہتا ہے، جو موجودہ شارٹ کٹ ثقافت کے خانے میں فٹ نہیں بیٹھتا۔

منفی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ادب کے ساتھ گھٹیا تصورات جڑ گئے ہیں، مثلاً ادب کو ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ سنجیدہ ادب۔ نثری و شعری متون کی قرائت۔ کے رجحان کو سوشل اور تفریحی میڈیا نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ غیر معیاری ادبی تخلیقات بھی ادب سے متنفر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوئی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بالادستی سر پر چڑھ کر بول رہی ہے۔ اور انسان دنیا کی منڈی میں صرف پروفیشنل مہارت پیدا کر کے بکاؤ سامان بنتا جا رہا ہے۔

دین اور ادب

ادب کو زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ آئینہ آپ کو وہی تصویر دکھاتا ہے جو تصویر اس کے سامنے ہوتی ہے، مگر وہ انسان کے باطنی احساسات و جذبات اور افکار و خیالات کی تصویر نہیں دکھا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ادب کا رشتہ زندگی سے اٹوٹ ہے۔ اسلامی ادب بھی دینِ اسلام اور بے کراں سمندر کے مانند وسیع ہے، اس لیے ادب۔ خصوصاً اسلامی۔ کا دائرہ کار محدود ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ فنی جمالیات، تعمیری اقدار اور پاکیزہ شعوری جذبات کو ساتھ لے کر آگے بڑھتا ہے، اس لیے ادب اسلامی کی جولانگاہ لامتناہی ہوتی ہے۔ البتہ اگر دنیا میں انسانیت، شرافت اور اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت ہے تو اس بنیاد پر اسلامی ادب بھی ایک حصار بناتا ہے، جہاں انسان دشمنی اور خدا کی زمین میں خدا کے خلاف باغیانہ سوچ کو پنپنے نہیں دیا جا سکتا۔

اسلامی ادب اور ادبا کا رویہ

کسی خاص ہیئت اور خاص طرز کے لوگوں کی

تحریروں کو ادب کے زمرے میں رکھنا اور مذہبی رنگ رکھنے والے قلم کاروں کو اپنے خود ساختہ ادبی زاویۂ نظر کے دارے سے خارج کر دینا' متعصّبانہ، غیر منصفانہ اور جابرانہ رویہ ہے۔ ادب کی بنیادی شرائط کے معیار و کسوٹی پر پوری اترنے والی تحریر کوئی سی بھی ہو، وہ ہر حال میں ادبی تحریر ہی رہے گی، مذہبی اور لا مذہبی کی قید کیوں؟ کسی روایتی انسان اور کسی لبرل شخص کے تصور، تخیل اور کسی کلاسیکی اور رومانی ادب کے دو حمایتیوں کے لیے دو معیارات کیوں؟۔ کسی خوبصورت چمن میں گلاب ہے تو وہ یقیناً گلاب ہی ہے، اگر یہ گلاب کسی مسجد یا مندر کے احاطے میں ہے تو اسے گلاب کہنے میں ہچکچاہٹ کیسی؟ یہاں جذبے کی صداقت، تعبیر کی دل کشی اور فکر و خیال کی تخلیقی صلاحیت کے عقب میں اگر مذہبی انسان نظر آتا ہے تو اُس سے بیر کیوں ہو؟ آخر کس منطق کے زور سے اس کی تخلیق کو دائرہ ادب سے خارج سمجھا جائے گا؟

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی ذیل کی تحریر سبھوں کے لیے غور و فکر کے روزن کھولتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ فرض کر لینا کہ مذہبی جذبے کی شاعری اعلیٰ اور کھری نہیں ہو سکتی محلِّ نظر ہے اور عصبیت کی چغلی کھاتا ہے۔ اصل معاملہ احساس کی شدت اور اس کے مکمل شعری اظہار کا ہے۔ اگر شعری کارنامہ پوری طرح سے شعور کی گہرائیوں میں جذب ہو چکا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسی شاعری ہمیں اپیل نہ کر سکے"۔

(نقد و نظر علی گڑھ شمارہ ۲۰ صفحہ ۳۳۶)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

"دین ہی کے حوالے سے شاعر کی نوا یادِ سحر بن جاتی ہے، جو چمن کو بہار کا آئینہ بنا دے اور ادب میں بہارِ جاودانی کی جھلک آ سکے۔ ہوس تو ایک نفس دو نفس حیات رکھتی ہے اور اقدارِ عالیہ ہمیں ثبات عطا کرتی ہیں"۔

(کاروان ادب جنوری-مارچ ۱۹۹۶ ص: ۱۵)

کیا دین و مذہب پر مبنی نظریہ کے لیے ادب میں کوئی گنجائش نہیں ہے؟

آل احمد سرور کہتے ہیں:

"یہ کہنا کہ مذہبی نظریہ، ادب میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا، غلط ہوگا۔ علاوہ اس کے کہ ماضی میں اس کے اثرات سارے ادب پر ملتے ہیں"

(تنقیدی نظریات از احتشام حسین ۹۱۲)

لوگ صرف ۱۸۵۷ کے بعد کی اردو شاعری کو دیکھ لیں کہ یہی زبان ملی احساسات کی ترجمانی کا وسیلہ رہی اور اسی اردو نے مسلمانوں کی فکری اور دینی زندگی کے خدوخال اور اسلامی اقدار و روایات کی پاسبانی و پاسداری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کچھ جدت پسند قلم کار نے قدامت پرستی اور فرسودگی پر ضرب لگانے کی آڑ میں مذہبی اقدار پر بھی نشانہ سادھنے کی کوشش کی ہے اور

کرتے ہی رہتے ہیں۔تو ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب سے مذہب کو خارج کر کے مذہب بیزاری کو فروغ دیا جائے۔ یہ وہ لوگ تھے، یا ہیں جو کمیونزم کے معاشی فلسفے کے حمایتی بن کر اُٹھے تھے اور 'مذہب افیون کی حیثیت رکھتا ہے' کی تبلیغ وتشہیر کر رہے تھے۔ کیونکہ (ان حضرات کی نگاہ میں) انسان کا سب سے بڑا اور شاید واحد مسئلہ معاش ہی کا ہے۔

مذہبی ادب اور مشرقی تنقید

مشرق کے مذہبی ادب اور مشرقی تنقید سے ان کے کد کی ایک بڑی وجہ مغربی فکر و فلسفہ کی کورانہ تقلید بھی رہی ہے۔ حالانکہ مغربی ادبا دنیا کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے کے لیے ادب کا بھرپور سہارا لیتے رہے ہیں۔ مغرب کا ادبی سرمایہ مذہبیت سے کبھی خالی نہیں رہا۔ جان ملٹن، ڈرائی ڈن، ٹی۔ ایس ایلیٹ، ہومر اور ورجل وغیرہ مذہب پہ کھلم کھلا تحریرات پیش کرتے ہیں۔

مغرب میں ادب و تنقید کا امام ٹی۔ایس ایلیٹ کا کہنا ہے:

''سارا کا سارا جدید ادب لادینیت کی وجہ سے خراب ہوگیا۔ وہ فطری کے مقابلے میں فوق الفطرۃ زندگی کی اہمیت وتقدیم سے ناواقف و بے خبر ہے''۔

(مذہب اور ادب ترجمہ جمیل جالبی صفحہ ۲۳۵)

ڈی۔ایچ لارنس کے قول کے مطابق:

''اب کوئی نیا اور جاندار ادب ہوگا تو وہ انسان اور خدا کے باہمی رشتے کے بارے میں ہوگا''۔

(تعمیری ادبی تحریک ص: ۳۲)

مذہب سے ادب کو خارج کرنے کے شوق میں ان لوگوں نے اقبال جیسے انقلابی مفکر و شاعر کو بھی جو مسلمانوں کی گم گشتہ تہذیب کی بازیافت کے لیے ان کو جھنجوڑ رہا تھا، فسطائی ہونے کا طعنہ دیا، اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس کی درد بھری شاعرانہ پکار کا تانا بانا اسلام تھا۔

ذہنی ساخت کجرو ہو تو فن بھی کجرو ہوگا

شعر ہو، معیاری نثر ہو، فنکار ہی کی شخصیت بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ دل و نگاہ میں روشنی اور پاکیزگی یوں ہی تو نہیں پیدا ہو جاتی۔ انسان کی عظمت اور احترام کے وسیع تصور اور اخلاقی اقدار کو گلے لگائے بغیر کسی فنکار کی شخصیت متوازن نہیں ہو سکتی۔ ذہنی ساخت میں کجروی ہوگی تو لازماً اس کا فن کجرو ہوگا۔ جس کا قلب داغدار ہو اس کا ادب بے داغ کیسے ہو سکے گا؟۔ یہ کون اور کیسے لوگ ہیں جو مذہبی تصور کی جگہ اپنے فن کی شوخیوں کو ادب میں فروغ دینا چاہتے ہیں۔ ذرا دو چار شعری اور نثری مثالوں میں ان کی جرأت و بے باکی تو ملاحظہ فرمایئے:

جوش نے کہا:

شبیر حسن خاں نہیں لیتا بدلہ
شبیر حسن خاں سے بھی چھوٹا ہے خدا

فیض نے کہا:

ایک فرصت گناہ ملی تھی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

کسی منچلے نے کہا:

جی خوش ہوا ہے مسجد ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

ندا فاضلی نے کہا:

گھر سے مسجد ہے بہت دور، چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

سجاد ظہیر اپنے چیلوں اور مریدوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اگر آپ کو کچھ لکھنا ہے، تو آپ ملا پن چھوڑ دیئے، لوگ آپ کا بھی مذاق اڑانے لگیں گے''۔

(سجاد ظہیر بحوالہ اردو ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمن اعظمی ص:۲۹۱)

سردار جعفری کہتے ہیں:

''ظاہر ہے یہ درویشی اور قلندری، شاہینی اور انفرادیت، تجدید مذہب اور احیایت اور تصوف ہمارے کام کی چیزیں نہیں، کیونکہ اس سے آج کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا''۔

(ترقی پسند ادب، از سردار جعفری ص: ۱۱۴)

خدائے رحمان و رحیم کی شان میں دریدہ دہنی اور مذہب بے زاری کے ان چند نمونوں کے بعد رابطہ ادب اسلامی کے بانی مولانا علی میاںؒ کا ایک اقتباس جس سے ان کے مذہبی ادبی نظریہ کی عکاسی ہوتی ہے ملاحظہ فرمایئے:

رابطہ ادب اسلامی کے بانیؒ

''ادب کی طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادب ایک آلہ ہے تعمیر کا بھی اور تخریب کا بھی۔ وہ ذہنوں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے اور اس میں ایسی جادوگری اور اللہ تعالی نے اس میں ایسی طاقت رکھی ہے کہ وہ بڑے بڑے فضلا اور ذہین لوگوں کو اس طرح مسحور کر لیتا ہے کہ ان کو جس راستے پر ڈال دیا جائے اور چلایا جائے وہ اسی راستے پر چل پڑتے ہیں۔ ادب کی راہ سے جو چیز مثبت یا منفی، ایجابی یا سلبی، تعمیری یا تخریبی داخل کی جا سکتی ہے، وہ دوسرے ذرائع سے داخل نہیں کی جا سکتی۔ ایک شعر پڑھ دیجیے، ایک فقرہ چست کر دیجئے، ایک ادیب کی چند سطریں پڑھ دیجئے، جو اس کا اثر ہوگا وہ کسی معقولات کے عالم اور فلسفہ کی کتاب کا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہماری نگاہ میں بڑی قدر و قیمت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ادب کی راہ سے بھٹکے ہوئے ذہنوں کو سنبھالا۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقی اور فطری ادیب ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے اندر مذہبی حقائق پر کچھ ایمان نہ ہو اور دل کے اندر کچھ درد نہ ہو۔ کیا بات ہے کہ مولانا جلال الدین رومی، شیخ سعدی، مولانا جامی، قدسی اور ہندوستان میں میر، درد اور مرزا مظہر جانِ جاناں اور آخر میں جگر کے

پائے کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ پھر اس کے بعد آخر میں اقبال کے پائے کا شاعر کون ہے؟

ادب و انشا کے سلسلے میں عام مورخ و نقاد اکثر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تحریر کی قوت، کلام کی تاثیر اور قبول عام اور بقائے دوام کے لیے سب سے زیادہ معاون عنصر لکھنے والے کی اندرونی کیفیت، اس کا یقین، دلی جذبہ، کسی حقیقت کے اظہار کے لیے اس کی بے چینی اور بے قراری ہے۔ ایسے کسی شخص کو جو اس اندرونی کیفیت سے سرشار اور اس کو دوسروں میں پیدا کرنے کے لیے مضطرب و بے قرار ہو، یا قدرت کی طرف سے ذوق سلیم بھی عطا ہو، الفاظ و اسالیب بیان پر ضروری حد تک قدرت بھی رکھتا ہو اور اس کی تحریر میں علم و ادب، عقل و استدلال اور حسن بیان کے ساتھ سوزِ دروں اور خون جگر بھی شامل ہو، تو اس کی تحریر میں ایسا اثر اور ایسا زور پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ہزاروں دلوں کو زخمی کرتی ہے اور سینکڑوں برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی تازگی و زندگی اور اس کی تاثیر و قوتِ تسخیر قائم رہتی ہے"۔

(کاروان ادب، جنوری-جون ۱۹۸۸ ص: ۱۳۱-۱۳۷)

حضرت مسیحؑ نے فرمایا:

"انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا، بلکہ اس بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے وہ زندہ رہتا ہے"۔ (باب استثناء، بائبل)

دل کی طرف حجاب تکلف اٹھا کے دیکھ

﴿فانی بدایونی﴾

دل کی طرف حجاب تکلف اٹھا کے دیکھ
آئینہ دیکھ اور ذرا مسکرا کے دیکھ

اس دور میں یہ طرز جفا آزما کے دیکھ
دل کے بجائے دل کے سکوں کو مٹا کے دیکھ

تسلیم کی نظر سے کرشمے رضا کے دیکھ
بیگانگی دوست کو اپنا بنا کے دیکھ

اس شورش حیات کو حد سے بڑھا کے دیکھ
یہ فتنہ اور حشر سے پہلے اٹھا کے دیکھ

یوں دیکھتا ہے تیرگی آب و گل میں کیا
شعلوں سے کھیل دل کو جلا اور جلا کے دیکھ

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی
ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ

تیری تجلیوں سے کسی طرح کم نہیں
دل کی تجلیوں کو کبھی دل میں آ کے دیکھ

اب کے ادائے خاص سے کر امتحان دل
جو برق طور پر نہ گری ہو گرا کے دیکھ

ہاں اہل دل کے حال سے غفلت محال ہے
اچھا یقیں نہیں تو مجھی کو بھلا کے دیکھ

دنیا کو دیکھنا تو میسر نہیں تجھے
ذرے کو دیکھنا ہے تو دنیا بنا کے دیکھ

فانیؔ سفینہ اب بھی نہ ڈوبے تو کیا کرے
طوفان کو نہ دیکھ ستم نا خدا کے دیکھ

اسلوبِ قرآنی وارشادِ رحمانی

مولانا اقبال احمد ندوی - استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اللہ رب العزت نے یہ دنیا آباد کی اور اسے زیب وزینت ورونق بخشی تو اسی کے ساتھ ہی دنیا میں آباد جن و بشر کی ہدایت ورہنمائی کا سامان بھی کیا۔ حضرتِ آدم علیہ الصلاۃ والسلام کو دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا۔ اُسی وقت سے نبیوں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ اُنھیں حسبِ ضرورت معجزے بھی عطا کیے اور ان پر آسمانی صحیفے اور کتابیں بھی نازل فرمائیں۔ نبیوں کی بعثت کا سلسلہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر ہمارے نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کی نبوت ورسالت تا قیامِ قیامت باقی و قائم رہنے والی ہے۔ آپ کی رسالت دائمی بھی ہے اور عالمی بھی۔ اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب ''قرآنِ مجید'' آپ کا زندہ جاوید معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی عالم گیر کتاب ہے۔ اس میں ہر عہد، ہر نسل اور ہر طرح کے حالات کے لیے ہدایت ورہنمائی موجود ہے۔ اس کی معجز نمائی بحیثیتِ مجموعی بھی ہے اور جزوی حیثیت سے بھی۔ یعنی قرآنِ مجید مکمل شکل میں تو ایک معجزہ ہے ہی، جس پر سارے مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اسی طرح اس کی ہر آیت بلکہ اس کا ہر ہر لفظ بھی مستقل ایک معجزہ ہے۔ اور اس کا اعجاز مختلف زبانوں، مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا رہا ہے کہ اس کے لیے آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے۔ آپ قرآنِ مجید کو ایک مرتبہ نہیں، سو مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ اور لاکھ مرتبہ پڑھیے تب بھی آپ کو اس میں حلاوت، طراوت، تازگی اور لذت وجدت محسوس ہوگی اور معلوم ہوگا کہ قرآنِ مجید آج ہی نازل ہوا ہے۔ قرآنِ مجید ایک بحرِ زخار ہے۔ ایک عمیق اور گہرا سمندر ہے۔ جس میں آبدار اور بیش بہا موتی اور خزانے مخفی ہیں۔ اس میں جو جتنا غوطہ لگائے گا، اتنا ہی اپنا دامن موتیوں سے بھر یگا۔

یہ قرآنِ کریم کا عجاز ہی ہے کہ کفارِ عرب ومشرکینِ مکہ نیز دشمنانِ اسلام نزولِ قرآن کے وقت سے لے کر اب تک باوجود بار بار کی تحدی کے اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے پیغمبرِ اسلام حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے متعدد جنگیں لڑیں، اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کرایا، اپنی عزت وناموس کو خاک میں ملایا، یہ سب کیا لیکن جو کرنے کا کام تھا، وہ نہ کیا یعنی قرآن کی کوئی مثال نہ پیش کر سکے اور کوشش کی بھی تو ناکام رہے اور منہ کی

کھائی۔ جب کہ وہ زبان کے دھنی اور بیان کے غنی تھے۔ خود کو اہلِ زبان (عرب) اور اپنے علاوہ ساری دنیا کو بے زبان (عجم) کہتے نہیں تھکتے تھے۔ پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکے اور دین دنیا دونوں میں نقصان اٹھایا۔

اعجازِ قرآنی کے اسیر اور اس کی جادو بیانی کے قتیل اپنے تو اپنے غیر بھی تھے۔ قرآن کا جادو سب پر چڑھ کے بولتا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے کا بہت مشہور ہے بلکہ قرآن کا سننا ہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنا۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رکن حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر قریب سے جا کر قرآن سنا تو اتنا متاثر ہوئے کہ خود فرماتے ہیں کہ "فلما سمعت القرآن رقّ له قلبی فبکیت، و دخلني الإسلام" یعنی جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل پسیج گیا اور میں شدتِ تاثر سے رو پڑا اور اسلام میرے اندر جاگزیں ہو گیا۔ ایک دوسری مشہور روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب اپنی حقیقی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اسلام لانے کی خبر سنکر ان کے گھر گیے اور انھیں مار کر لہولہان کر دیا تو اپنی بہن کا خون بہتا ہوا دیکھ کر نادم ہوئے اور قرآن سنانے کی فرمائش کی اور جب حضرت فاطمہ کے شوہر حضرت سعید نے انھیں سورہ طہ پڑھنے کو دی تو شروع کرتے ہی بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: "ما أحسن هذا الكلام و أكرمه" کہ واہ کیا ہی عمدہ اور پاکیزہ کلام ہے۔

اسی طرح ولید بن مغیرہ قرآن سنکر متاثر ہوا تو قریش نے اسے بددین ہونے کا طعنہ دیا اور ابوجہل کو اس کے پاس سمجھانے کے لیے بھیجا تا کہ وہ اسلام قبول نہ کر سکے تو اس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا: "إن لقوله حلاوة، و إن عليه لطلاوة، و إنه ليحطم ما تحته، و إنه ليعلو و ما يعلى" کہ اس میں شیرینی و حلاوت ہے، اس میں تروتازگی و طراوت ہے، یہ کلام اپنے سامنے آنے والے سارے حریفوں کا قلع قمع کر دیتا ہے، انتہائی بلند و ارفع کلام ہے، کوئی کلام اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس پر بھی ابوجہل نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور چاہا کہ ولید قرآن کے بارے میں کوئی منفی تبصرہ کرے تو اس وقت اس نے کہا تو یہ کہا: "إن هذا إلا سحر يؤثر، أما رأيتموه يفرق بين الرجل و أهله و موالیه" کہ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ کلام جادو ہے اور جادو بھی وہ جو سر چڑھ کے بولتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ انسان کو اس کے اہل و عیال، گھر والوں اور متعلقین سے جدا کر دیتا ہے۔ قرآن کریم کی سورہ مدثر کی یہ آیات اسی واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں: {إنه فكر و قدر، فقتل كيف قدر، ثم قتل، كيف قدر، ثم نظر، ثم عبس و بسر، ثم أدبر و استكبر، فقال: إن هذا إلا سحر يؤثر}

(سورہ مدثر: ۱۸-۲۴)

(التصویر الفنی في القرآن، سید قطب، ص ۱۲-۱۴ ملخصاً)۔

دشمن اسلام عتبہ نمائندۂ کفار بن کر خدمت نبوی میں حاضر ہوتا ہے اور طویل گفتگو کرتا ہے، آپ (ﷺ) فرماتے ہیں: ابوالولید! کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، تب آپ (ﷺ) نے قرآن کریم کی آیات {حم، تنزیل من الرحمن الرحیم} اور {فإن أعرضوا فقل أنذرتكم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود} (سورہ فصلت : ۲۴) سنائی۔ سن کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہتا ہے: (و اللہ لقد سمعت من محمد کلاماً ما ھو من کلام الإنس، و لا من کلام الجن، و إن له لحلاوة، و إن علیه لطلاوة، إن أعلاه لمثمر، و إن أسفله لمغدق) ۔ بخدا میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) سے ایک ایسا کلام سنا جو نہ کلام انسانی ہے اور نہ کلام جنی، اس کلام میں بڑی مٹھاس ہے، یہ کلام بڑا ہی بارونق و پُرنور ہے۔ اسے اوپر سے دیکھیں تو پھلوں سے لدا ہوا اور نیچے سے دیکھیں تو بڑا ہی پُر بہار ہے۔

عرب سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کو مغلوب کرنے میں جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں۔ لیکن عربوں نے اپنی خاص مجلسوں میں قرآن کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا اور جو ان میں منصف مزاج تھے، انھوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا۔ قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:

”اے قوم قریش! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (ﷺ) تمھاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب ان کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے تو تم انھیں جادوگر بتانے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادو گروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سنے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔ اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں ہیں، ہم نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا اور ان کا کلام سنا ہے، ان کو ان سے کوئی مناسبت نہیں، ہم خود بحرِ شعر کے شناور ہیں اور بڑے بڑے شعرا کے کلام ہمیں زبانی یاد ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا ہے اور ان کی بکواس سنی ہے، ان کے مختلف کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملے میں غور کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں“۔

(مفتی محفوظ الرحمن عثمانی۔ کاروان ادب جلد ۱۵، شمارہ

۳،اکتوبر دسمبر ۲۰۰۸ ص ۱۵-۱۶)

انسان تو انسان ، جنات بھی قرآن کی معجز نمائی اوراثر انگیزی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ: {إنا سمعنا قرآناً عجبا} (سورۃ الجن:۱) کہ ہم نے ایک عجیب اورانوکھا قرآن (کلام) سنا۔

قرآن کی یہی تاثیر تھی جس کی وجہ سے قریش نہیں چاہتے تھے کہ کوئی قرآن سنے تاکہ اس کے قرآن سے متاثر ہوکر ایمان لانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ وہ اپنے لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے تھے جسے قرآن نے خود نقل کیا ہے کہ: { لا تسمعوا لهذا القرآن و الغوا فيه لعلكم تغلبون} (سورہ فصلت:۲۶) یعنی قرآن نہ سنو اور جب پڑھا جائے تو خوب شور مچاؤ، اس طرح شاید تم جیت سکو، ورنہ تو ناکامی ہی تمھارا نصیب ہے۔ اس طرح دانستہ یا نادانستہ وہ قرآن کی معجز بیانی، سحر طرازی اوراثر انگیزی کے معترف تھے۔

قرآنِ کریم کی اس تاثیر کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے براہ راست عقلِ انسانی کو اپنا مخاطب بنایا ہے اور اس کے خطاب میں انسان کے صحیح جذبات اورانسانی احساسات وشعور کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے بیان و اسلوب میں شوکتِ الفاظ ، رفعتِ مضامین، عبارت کا حسن و جمال، آواز کا زیر و بم اوراتار چڑھاؤ، نظم وتالیف، ترتیب وتنسیق وغیرہ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ایک ہی معنی کو مختلف پیرایۂ بیان میں پیش کرنا، کہیں بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کرنا اور پھر اس تکرار کی وجہ سے پڑھنے والے پر کسی قسم کی گرانی کا نہ ہونا، یہ بھی قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ نیز قرآن معانی و معقول چیزوں کو محسوس انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ چیز مشاہد ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم کبھی استعارہ، تشبیہ اور کنایے کو کام میں لاتا ہے اور کبھی صاف و دلکش اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ لیکن کہیں بھی حسن و جمال کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا اور کلام کی تاثیر میں ذرا بھی کمی نہیں آتی ہے۔ یہی دراصل اس کا اعجاز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے اعجاز بیان نے انسانوں کے ہر طبقے کو ہر دور میں حیرت زدہ کر رکھا ہے۔

(مفتی سید احمد بختیاری۔ کاروان ادب جلد ۱۵، شمارہ ۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۸ ص ۳۸-۳۹ بتغیر یسیر)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت اختیار کیا بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کا اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے۔ اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہوتی۔ یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔ حضرت مولانا عبد اللہ مغیثی صاحب قرآن کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

"قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا ایسا جامع کلام ہے جس میں تمام علوم موجود ہیں۔ اس کی وسعتِ معانی و رفعتِ مضامین کا یہ عالم ہے کہ نطق اس کے بیان

سے عاجز اور فہم وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس کے محامد کا شمار، اس کے مکارم کا بیان، اس کے علوم کی تحدید اور اس کے معانی کی تشریح طاقتِ بشری سے بالاتر ہے۔ کیونکہ قرآنی الفاظ کی تہہ میں اسرار کا ایک بحرِ زخار موج زن ہے۔ اربابِ بصیرت جب اس میں غوطہ لگاتے ہیں تو انھیں بے شمار علم و حکمت کے موتی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کی امتیازی شان اور اس کے رموز و اعجاز کا یہ عالم ہے کہ اسے سن کر جنات یہ کہے بغیر نہ رہ سکے: { إنا سمعنا قرآناً عجباً يهدي إلى الرشد فآمنا به } (سورہ الجن:۱)

(مولانا عبداللہ مغیثی، کاروانِ ادب، جلد ۱۵، شمارہ ۲، جولائی ستمبر ۲۰۱۵، ص ۱۱)

"حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "الفوز الکبیر" میں لکھا ہے کہ قرآن پاک نہ شعر ہے نہ نثر، اس کے باوجود حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک جاذبیت، کشش اور بلا کی مقناطیسیت رکھی ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو موزونیت اور تناسب رکھا ہے، فطرت کی اسی موزونیت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن پاک کے اوزان و الفاظ اور الفاظ و آیات کا نظم و ترکیب خود ایک معجزہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک فطرتِ انسانی کو موہ لیتا ہے اور دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔"

(مولانا عبداللہ مغیثی، کاروانِ ادب، جلد ۱۵، شمارہ ۲، جولائی ستمبر ۲۰۱۵، ص ۱۳)

مولانا صدر الحسن ندوی مدنی اسلوب قرآنی پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

" قرآن کے اعجاز بیانی کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا طرۂ امتیاز وہ حسین تعبیر، دلکش اسلوب اور اچھوتا طرزِ اظہار ہے جس کی روح پورے قرآن میں اغراض و مقاصد کے اختلاف کے باوجود برگِ گل میں بادِ سحرگاہی کے نم کی طرح موجود و عریاں ہے۔ تبشیر ہو یا انذار، خانوادۂ یوسف کی کہانی ہو یا امم بائدہ کے واقعات، بنی اسرائیل کی داستانِ مظلومیت ہو یا فرعونی قہر و جبروت کا تذکرہ، کسی وقوع پذیر واقعے کی عقدہ کشائی ہو یا اصحابِ کہف و رقیم کی گراں خوابی کی عبرت پذیری، کفارِ مکہ کے غیر انسانی سلوک کی تصویر کشی ہو یا نبیِ رحمت (ﷺ) کے جذبۂ دعوت و خیر خواہی کی مدح سرائی، برادرانِ یوسف کی طوطا چشمی ہو یا دلِ یوسف کی وسعت و پہنائی، جنت اور نعمتِ جنت کا خوان ہو یا ساکنانِ جہنم کی چیخ و پکار، حورانِ بہشتی کا تذکرۂ دل پذیر ہو یا کوثر و تسنیم کا جامِ فرحت بخش، میدانِ حشر کا اندوہناک منظر ہو یا نامۂ اعمال کی پیشی کی گھڑی، دیدارِ مالک کشش جہات کا لمحہ جاں فزا ہو یا { كلوا و اشربوا

هنيئاً بما أسلفتم في الأيام الخالية } کا صلائے عام، اوامر ونواہی کی عناں گیری ہو یا فرائض و واجبات کا ساغرِ روح پرور، عذاب و وعید کی نمک پاشی ہو یا بشارت وضیافت کا زمزمۂ دل کشا، ناقۂ ثمود کی معجز نمائی ہو یا قومِ عاد کی خود پرستی و خدا فراموشی، کشتیِ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم کا رازِ سربستہ ہو یا بنی اسرائیل کی بادیہ پیمائی، حضرت اسماعیل کا جذبۂ جاں سپاری ہو یا معمارِ کعبہ کی امتحان وآزمائش میں سرخ روئی۔ طالوت کا دستِ کارکشا ہو یا ملکۂ سبا کی مومنانہ سپراندازی ۔ غرض قرآن کا اسلوب کبھی سرور آفریں، تو کبھی سیل تند رو، کبھی نغمۂ سامعہ نواز، تو کبھی صاعقۂ چشم ربا، کبھی مثل سمندر پرسکوں تو کبھی مثل آبشار خاراشگاف، کبھی دردِل پر دستک ِ جاں نواز تو کبھی رگِ جاں پر نشتر زنی، کبھی غیظ و غضب کی شمشیرِ براں تو کبھی شفقت و رحمت کا ابرِ باراں، کبھی طبل میدانِ کارزار کا آہنگ غمناک تو کبھی بربطِ مجلسِ ہم نفساں کی نغمگی، کبھی ابر باد و باراں کا اندیشہ تو کبھی { لاتقنطوا من رحمة الله } کا مژدۂ سرمدی، احوال وواقعات کی تصویر کشی ایسی کہ ارژنگ مانی کو بھی منہ چھپاتے نہ بنے اور حقیقت کی مصوری ایسی کہ حقیقت کی بے حجابی دیدہ وروں کو اپنی دیدہ وری پر رشک کرنے پر مجبور کردے۔ سیہ بختی اور حرماں نصیبی کی ایسی تمثیل کہ سازِ ہستی بے صدا ہوجائے اور نفسیاتِ بشری کی ایسی نقشہ گری کہ حال قال ہوجائے اور جذبات و احساسات کی ایسی منظر نگاری کہ دل کی دھڑکنیں صفحۂ قرطاس پر سرکتی ہوئی محسوس ہوں۔"

(مولانا صدرالحسن ندوی مدنی، کاروانِ ادب، جلد ۱۵، شمارہ ۲، جولائی ستمبر ۲۰۱۵ء ص ۴۱-۴۲)

یوں تو پورا قرآنِ کریم اور اس کی ہر ہر آیت اپنے اندر بیشمار درسہائے عبرت رکھتی ہے اور اس میں عقلمندوں کے غور وفکر کے لیے بہت سی چیزیں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند آیتیں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ آپ ان کی معنویت اور گہرائی وگیرائی کا اندازہ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی ایک آیت کا مختصر سا ٹکڑا ہے: { و لا تكونوا كالذين نسوا الله فأنساهم أنفسهم } (الحشر: ۱۹) کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو کہ جنھوں نے اللہ کو بھلایا تو اللہ نے ان کو ایسا بنادیا کہ وہ اپنے ہی کو بھول گیے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تمدن کے شاید کسی دور میں اس آیت کا ظہور اس طرح نمایاں اور صاف طریقے پر نہ ہوا ہو جتنا اس دورِ تہذیب وترقی میں، انسان کا اپنی ذات کے معاملات میں انہماک، اپنی ذات سے شیفتگی شاید اتنی کسی زمانے میں نہ پیدا ہوئی ہو جتنی اس دور میں۔ خود پرستی کا فلسفہ شاید کسی عہد میں ایسا

مرتب نہ ہوا ہو اور اس کی اشاعت شاید کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوئی ہو جیسی اس زمانے میں۔ اپنے سوا ہر چیز کے انکار کا ذوق اور جوش شاید کبھی اتنا عام نہ ہوا ہو جتنا اس موجودہ سوسائٹی میں۔ لیکن واقعہ اور دن رات کا مشاہدہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مسائل سے سب سے زیادہ غافل ہے؟ اپنے انجام سے سب سے زیادہ بے فکر ہے؟ اپنی ذات سے سب سے زیادہ بے پروا ہے؟ حقیقی لذت و راحت سے سب سے زیادہ محروم ہے؟ زندگی کے ذخیرے میں اس کا اپنا حصہ سب سے زیادہ کم ہے۔ وہ روپیہ ڈھالنے کی مشین بن کر رہ گیا ہے جو اپنے ڈھالے ہوئے سکوں سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس کا حصہ زندگی میں صرف اتنا ہے کہ اس کو اتنا تیل دیا جاتا رہے جس سے وہ چلتی رہے۔ جذبات و احساسات سے عاری، لذت و الم سے محروم، مسرت و کلفت سے بے خبر ایک بے جان مشین ہے۔" (قرآنی افادات صفحہ ۵۴)

سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: {ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت و فرعها في السماء، تؤتي أكلها كل حين بإذن ربها، و يضرب الله الأمثال للناس، لعلهم يتذكرون} (سورہ ابراہیم: ۲۴-۲۵) ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

آپ اندازہ لگائیے کہ اس مختصر سی آیت میں اسلام کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔ اس کا مکانی رقبہ بھی آ گیا اور زمانی رقبہ بھی۔ اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آ گیا اور اس کے نقطۂ عروج کی داستان بھی۔

{ ادع إلى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة، و جادلهم بالتي هي أحسن } (النحل: ۱۲۵) آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجیے پسندیدہ طریقے سے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حکمت کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان نہیں ہے۔ اسی طرح "موعظت" بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے۔ "حسنہ" کا لفظ بھی لا محدود معانی پر مشتمل ہے۔ قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے۔ ایجاز و اختصار بھی ہے اور بیان و شرح بھی۔ حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی

اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقع پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے۔ سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے اور حکمت و موعظت الگ ہے۔" (افادات قرآنی صفحہ ۸۳)

{ یا أیھا الذین آمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا، و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون }

(سورہ آل عمران: ۲۰۰)

ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، "و صابروا" اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کا ماحول پیدا کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کی ترغیب دو، "و رابطوا" اور جمے رہو، سرحد کی حفاظت کرو، سرحدوں پر جمے رہو، "و اتقوا اللہ" اور اللہ سے ڈرو، احتیاط سے کام لو، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر کام کیا کرو "لعلکم تفلحون" تا کہ تم کامیاب ہو۔

آج ہندستان میں ظلم و ستم کا جو بازار گرم ہے۔ مسلمان پوری طرح مظلوم ہیں۔ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے درپے آزار ہیں۔ مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ ایسے میں یہ قرآنی اعجاز ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو، "وصابروا" اور جمے رہو، دیوار بنے رہو، ان فسادات، ان نازک حالات، ان حملوں، تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلے میں چھاؤنی بنے رہو۔

یہ ہیں چند نمونے اعجاز و ایجاز کے اور ارشاد و ہدایت کے، جو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کیے گیے۔ ورنہ قرآن تو ایک بحر زخار ہے جس کا نہ اُور ہے نہ چھور ہے۔ اس کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگانا انتہائی مشکل و دشوار ہے۔ اس کا ہر ہر لفظ کسی بیش قیمت موتی کی طرح آبدار ہے جو ہر قلبِ سلیم پر دستک دینے کو تیار ہے۔

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں

﴿ساغر صدیقی﴾

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں

میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

میں نے جن کے لیے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہدِ وفا یاد نہیں

کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی چراغوں کی ضیا یاد نہیں

صرف دھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا، کس سے خفا یاد نہیں

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغرؔ کو خدا یاد نہیں

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ایک نادر عربی مرثیہ

﴿ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ رفیق اعزازی دارالمصنّفین اعظم گڑھ﴾

مولانا سید سلیمان ندویؒ [۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء] کے اوصاف وکمالات میں بڑی جامعیت تھی۔ اس میں ان کی شاعری بھی شامل ہے۔ انہوں نے اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں دادِ سخن دی۔ ان کے اردو کلام کا مجموعہ ''ارمغانِ سلیمان'' عرصہ ہوا کراچی سے شائع ہوا تھا۔ حال ہی میں اس کا نیا ایڈیشن دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے لکھا ہے:

''ممتاز شامی ادیب اور شاعر استاد عمر بہاء الامری سید صاحب کے قیامِ پاکستان کے زمانہ میں وہاں شام کے سفیر تھے۔ ان سے سید صاحب کے مخلصانہ مراسم تھے۔ ڈاکٹر سلمان ندوی صاحب کی روایت کے مطابق وہ سید صاحب کا عربی دیوان دمشق سے شائع کرانے کے مقصد سے اپنے ساتھ لے گئے، لیکن نہ تو اس کی اشاعت ہوسکی اور نہ پھر اس کا کچھ پتا چلا۔ اس طرح اس قیمتی ادبی سرمایہ سے علمی دنیا محروم رہ گئی۔'' (ارمغانِ سلیمان، ص:۵)

یہ بات بھی افسوس ناک ہے کہ مذکورہ واقعہ کے بعد سید صاحب کے عربی دیوان کی ترتیب وتدوین اور اشاعت کی کوئی کوشش بھی نہیں ہوئی۔ البتہ بہن ڈاکٹر سطوت ریحانہ نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ ''عربی زبان وادب کے ارتقا میں سید سلیمان ندوی کی خدمات'' کے ایک باب میں سید صاحب کی نادر عربی تحریروں کو یکجا کیا ہے، لیکن اس میں سید صاحب کا ایک نادر عربی مرثیہ، جو انہوں نے خان بہادر منشی اطہر علی (۱۸۴۷ء-۱۹۰۶ء) کے انتقال پر ندوہ کے دور طالب علمی میں کہا تھا اور جو منشی جی کی وفات کے بعد ان کے نعتیہ قصیدے کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں مطبع شام، اودھ، لکھنؤ میں طبع ہوا ہے، شامل نہیں ہے۔ منشی اطہر علی اطہرؔ کا وہ مرثیہ اس ناتمام ''نعتیہ قصیدہ'' میں شامل ہے۔

خان بہادر منشی اطہر علی ابن منشی ریاست علی کاکوروی، کاکوری کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی وفارسی کی تعلیم نامور اور جید علما سے حاصل کی۔ بعد ازاں وکالت کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا اور لکھنؤ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ عرصہ تک وہ لکھنؤ میں میونسپل کمشنر اور آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ منشی امتیاز علی کے بھوپال میں وزیرِ اعظم ہو کر لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد انجمنِ تعلقہ دارانِ اودھ

کے مشیرِ قانونی منتخب ہوئے اور اپنے عہدے کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

منشی اطہر علی اطہرؔ کو تعلیم سے گہری دلچسپی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ دینی تعلیم کا مرتبہ جدید انگریزی تعلیم سے بڑھا ہوا ہے۔ اپنے اسی نقطۂ نظر، جو دراصل ندوۃ العلماء کا نظریۂ تعلیم ہے، کے تحت انہوں نے تحریکِ ندوۃ العلماء سے گہری دلچسپی لی۔ ایک اجلاس کی صدارت کی اور صدارتی خطبہ پڑھا، جو ''مجموعۂ خطبات'' میں شامل ہے۔ تعلیم سے ان کی دلی تعلق کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ منشی جی کی تحریک پر لکھنؤ میں صنعت وحرفت کا اسکول قائم ہوا تھا۔

منشی اطہر علی اطہرؔ کا شعروسخن سے بھی گہرا تعلق تھا۔ غزل گوئی کے علاوہ نعتیہ شاعری کا بھی وہ خاص ذوق رکھتے تھے۔ متعدد نعتیہ قصائد ان کی یادگار ہیں، جن میں بعض چھپے اور بعض غیر مطبوعہ رہے۔ محمد رضا صبرؔ کاکوروی سے انہیں شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

منشی جی کو تحریکِ ندوۃ العلماء سے خصوصی دلچسپی تھی اور اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ تحریکِ ندوہ کے ۱۸۹۷ء کے اجلاس کے تمام اخراجات انہی نے برداشت کیے، مگر انہوں نے علامہ شبلی کی بڑی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ ندوہ کے ایک اجلاس میں ان کی تقریروں پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا، لیکن خود ان کی مخالفت ان کے ایک حریف (سندیلہ کے چودھری) نے حکومت سے شکایت کر کے کی، جس کے نتیجے میں انہیں برطانوی ہند کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ حیدرآباد چلے گئے۔ بعد ازاں وہاں سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مدینہ منورہ ہی میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

منشی جی کی وفات کے بعد ۱۹۰۷ء میں ان کا ایک نامکمل ''نعتیہ قصیدہ'' شائع ہوا۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مرثیۂ اطہر علی شامل ہے۔ یہ مرثیہ ہاتھ آیا تو خیال ہوا کہ کیوں نہ اسے اہل ذوق کی نذر کیا جائے۔ مرثیہ درجِ ذیل ہے:

أفيضي يا شؤونَ على بجيل
أتاه الموتُ وهو ابنُ السبيل

اے گوشۂ چشم! ایسے بزرگ پر آنسو بہا جس نے غربت میں وفات پائی۔

خطيبُ ندينا سهلٌ صعب
وفي وعرِ الطريقِ لنا دليل

وہ ہماری مجلس کا مقرّر اور سختیوں کو آسان کرنے والا اور مشکل راستوں میں ہمارا رہبر تھا۔

على الإسلامِ له لَهَفٌ غيور
وقائدُنا إلى الأمرِ الجليل

اس کو اسلام پر حسرت اور غیرت تھی، بڑے بڑے کاموں میں وہ ہمارا سرخیل تھا۔

قضىٰ فينا من الأعوامِ دهراً
وما في الطبعِ من خُلُقٍ عليل

اس نے مدتوں ہم لوگوں میں زندگی بسر کی، لیکن مزاج میں بیمار اخلاق نہ تھے۔

تدلُّ كما يدلُّ عليه جودٌ

ضیاعُه علی الحسبِ الأثیل
جس طرح سخاوت اس کو بتا دیتی تھی، اس کے کارنامے اس کے معزز حسب پر دال ہیں۔

رهینَ الرمسِ، لمَ أعرضتَ عنا؟
فأسفر عن محیّاک الجمیل
اے ساکن گور! تو نے ہم سے کیوں منہ پھیر لیا؟ اپنے خوب صورت چہرے سے پردہ ہٹا دیجیے۔

و کنت لنا ملاذاً دون همٍّ
و ملجأنا من الخطبِ الوبیل
تو ہمارے لیے مصیبتوں میں مامن تھا اور مصائب سے ملجا تھا۔

فماذا المکثُ؟ ما بلغتَ شیئاً
ألمْ یصلُک من الحزنِ الطویل؟
پھر یہ توقف کیوں ہے؟ کیا اب تک تجھ کو ہماری مصیبت کا حال نہیں معلوم؟

لماذا لا تردُّ لنا جواباً
کأنک ما أصختَ إلی العویل
ہماری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیا جاتا؟ گویا اب تک ہماری فریاد تیرے کانوں تک نہیں پہنچی۔

لقیتَ الموتَ مکتهلاً غریباً
أشمسَ الفضلِ والکرمِ الجزیل
اے آفتابِ فضل وسخا! تو نے غربت کی حالت میں کمالِ سن سے پہلے وفات پائی۔

و یوماً لم تغبْ شمسُ □رواحٍ
فکیف أفلتَ فی أفقِ الوحیل؟
حالانکہ کوئی آفتابِ عصر نہیں ڈوبتا، پھر حیرت ہے کہ تو موت کے افق میں کیوں کر ڈوبا۔

أکفُّ الیتامی والأراملِ
و مأوی صاحبِ الزادِ القلیل
اے بیوہ اور یتیموں کے مامن اور غریبوں کے ملجا!

دعوتَ اللهَ أن یتقبّلَ الحجَّ
منک، إذًا دعاکَ راضیَ القبول
تو نے خدا سے چاہا کہ خدا تیرا حج قبول کرلے، مگر رضائے قبول نے خود تجھ کو قبول کرلیا۔

ثویتَ ببلدٍ وترکتَ أرضاً
نشأتَ بها وعشتَ بلا خمول
تو مدینہ میں بس گیا اور اس سرزمین کو چھوڑ دیا جس میں تو پلا اور جہاں شہرت کے ساتھ زندگی بسر کی۔

نباکَ لکناؤ و أمساءَک الهندُ
یا مأوی الأجانبِ و الخلیل
اے یار و اغیار دونوں کے ملجا! کیا لکھنؤ تجھ کو موافق نہ آیا یا ہندوستان ہی تجھ کو پسند نہ آیا؟

فغادرتَ الهنودَ و بنتَ عنهم
وجاورتَ المدینةَ کالنزیل
جو ہندوستان والوں کو چھوڑ کر ان سے الگ ہوگیا اور مثل مسافر کے مدینہ میں آباد ہوگیا۔

نعم آثرتَ أرضاً ذاتَ مجدٍ

على أرضِ المهانةِ والخذول
ہاں! ہاں! تو نے عزت کی زمین کو ذلت اور عداوت کی سرزمین پر ترجیح دی۔

فنمتَ بمضجعٍ فی رمسِ أرضٍ
أحاطَ بها جناحا جبریل
تو ایسی زمین کی خواب گاہ میں سو گیا جسے جبرئیل کے پر ہر طرف سے سایہ کیے ہوئے ہیں۔

ربیتَ و ما رأیتَ إذا شیئاً
غرستَ و ما اقتطفتَ جنیَ النخیل
تو نے ہم کو (طلبائے دارالعلوم) پالا، مگر جب جوان ہوئے تو تو نے ہم کو نہیں دیکھا، تو نے درخت لگا کر اس کے پھل نہیں چنے۔

رجونا منک عوداً بالهدایا
فجاءَ البرقُ بالعبءِ الثقیل
ہم آس لگائے تھے کہ تو تحفہ لے کر لوٹے گا، لیکن تارِ برقی ایک بارِ گراں لایا۔

نعاکَ فعینُنا أهدتْ دموعاً
إلیکَ کمثلِ سُکوبِ سجیل
یعنی تیری موت کی خبر اس نے دی تو ہماری آنکھوں نے تجھے ابرِ باراں کی طرح آنسوؤں کا ہدیہ بھیجا۔

وقد جزعتْ علیکَ بغیرِ صبرٍ
قلوبُ شبابِ قومِکَ والکهول
اور تیری قوم کے جوان، بوڑھے سب کے دلوں نے بے صبری سے تجھ پر ماتم کیا۔

سقیٰ جدثاً بضَحْضَحِ کلِّ صوبٍ
نقیِّ الماءِ هطّالٍ هموم
خدا ہر صاف پانی والے ایسے ابرِ باراں سے تیری قبر کو سیراب کرے۔

هداه الرعدُ ساقَ قطیعَ برقٍ
وزمّتْه یدُ ریحِ القبول
رعد جس کی حدی خوانی کرتا ہو اور بجلی جس کا کوڑا ہو اور بادِ صبا کے ہاتھ میں جس کی باگ ہو۔

أعینی ما استطعتما الدمعَ بُکیا
فلا أسلو عن الوزعِ الجلیل
اے آنکھ! تجھے جس قدر ہو سکے، آنسو بہائے جا، کیونکہ اس غیر معمولی مصیبت سے صبر نہیں ہو سکتا۔

کأن الجفنَ من عینی شطٌّ
وجاری دمعُه ماءُ السیول
آنکھوں کی پلکیں گویا ساحل ہیں اور ان سے جاری ہونے والے آنسو دریا ہیں۔

(قصیدۂ نعتیہ، ص: الف تاج)

سید صاحب کا یہ مرثیہ اپنے اندر متعدد خصوصیات رکھتا ہے۔ مثلاً شاعر نے منشی جی کی سیرت و شخصیت کا خاکہ اپنے الفاظ سے کھینچ دیا ہے اور جس طرح جود و سخا، فیاضی، رحم دلی اور ندوہ سے انہیں خاص تعلق تھا، ان سب اوصاف کی مرقع آرائی اس میں آ گئی ہے۔ امید ہے عربی ادبیات کا مذاق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک قیمتی اور عمدہ سوغات ثابت ہوگی۔

سرگوشی

مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

پڑھتے آئے ہیں کہ اچھی شاعری وہ ہے جس میں 'وجدان' فکر سے مربوط ہوجائے؛ لیکن یہی بات اچھی نثر کے لیے بھی برحق ہے۔ اور یہ وجدان کیا ہے؟ اگر صوفیوں کے وجد سے مناسبت دیکھی جائے تو ظاہر ہے ایک بےخودی کی سی کیفیت! لیکن 'وجدان' کے اصل معنی تو کھوئی ہوئی چیز کے پانے کے ہیں، یا پھر ایسی چیز کے دریافت کرنے کے ہیں جس میں جدت ہو۔ مطلب جو بھی ہو، یہاں ایک ایسی کتاب اور اس کے مضامین کا ذکر مقصود ہے جو نثری ادب میں واقعی فکر اور وجدان کے معانی سے لبریز ہیں، اور دوسروں کو سرشاری و سیرابی سے بھی ہم کنار کرتے جاتے ہیں۔

کتاب کا نام ''سرگوشی'' ہے۔ سرگوشی اگر کانا پھوسی کے معنوں میں ہو تو اس کے معیوب ہونے میں کوئی شک نہیں؛ لیکن اگر یہی سرگوشی' آخرِ شب کی تنہائی اور نم فضاؤں کے سکوت کے عالم میں زیرِ لب، دل و دماغ کے پاک جذبات کی کہانی بن جائے تو پھر اس کو سرگوشی کہیں یا مناجات کا نام دیں، یہ اس کی پاکیزگی کی سچائی ہی کہی جائے گی۔

نثری ادب کے اصناف میں خطوط نگاری، تبصرہ نگاری اور ایک حد تک افسانہ نگاری میں دوسروں کے سامنے، آہستہ خود کلامی اور صرف کسی ایک وجود سے دل کی باتیں کہنے کی فرصتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ادب کی دنیا میں یہ عمل سرگوشی کے نام سے کسی صنف کی پہچان ہو یا نہ ہو، لیکن مناجات کا لفظ اس صنف کی ضرورت کی جانب اشارہ ضرور کرتا ہے۔

سرگوشی کے لیے قلم اور کاغذ وہ ذریعہ نہیں جس کے بغیر ادبی اظہار کا تصور ناممکن سا ہے۔ اس کے لیے تو وہی بات دہرائی جاسکتی ہے کہ جس طرح شعر کی تخلیق کے لیے خونِ جگر اور جذبہ اور فکر اور دل کی واردات سے پیدا ہونے والی نغمگی اور موسیقی ضروری ہے' اسی طرح سرگوشی کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں اور لمحوں میں وہ سب ہوتا ہے جو ایک لمحاتی راز و نیاز کو طول طویل فلسفیانہ بحثوں سے زیادہ کارگر بنا دیتا ہے۔ کہیں اس قسم کے خیالات نظر سے گذرے تھے کہ کسی ادبی اظہار کے لیے سامعین کی ضرورت ہوتی تو کبھی قارئین کی؛ لیکن سرگوشی کرنے کے لیے تو بس اپنا وجود، اپنی روح اور اپنی بے تابی اور بےقراری ہی کافی ہے۔ سامنے اگر وہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا، لیکن اس کی جلوہ گری اس شوق کو فزوں تر

کرتی ہے کہ اس کو چھوا جائے، اس کے جلوؤں کو نگاہ و دل میں بسایا جائے، اور پھر اس سے اس طرح ہم کلام ہوا جائے کہ اس تکلم کی لذت میں کسی اور کی شرکت نہ دل کو گوارا ہو اور نہ دماغ کو۔

تخلیق کار سے شناسائی کا سب سے معتبر ذریعہ ظاہر ہے اس کی تخلیقات ہی ہوتی ہیں۔ اگر یہ تخلیق کار' خالقِ کائنات کی صورت میں ہو تو کائنات کا ذرہ ذرہ سرگوشیوں کی ایک بے کراں دنیا سامنے لے آتا ہے۔ وہی دنیا جس کے مناظر، فطرت کے مظاہر میں بدلتے رہتے ہیں، اور 'کل یوم ھو فی شان' کا نغمہ گنگناتے جاتے ہیں۔

کوہساروں میں، مرغزاروں میں، وادیوں میں، اور تاحدِ نظر بچھے میدانوں میں، سمندر کی موجوں میں، دریاؤں کے خمدار راستوں میں، رنگ برنگے پرندوں میں اور ہزار رنگوں میں نہاتے ہوئے پھول پتیوں میں، ریگزاروں کی چمک میں، کنکروں اور پتھروں کی دمک میں، شعلوں کے رقص میں، شبنم کی لطیف خنکیوں میں، یعنی زمین و آسمان کی تمام تزئینوں میں ایک پکار ہوتی ہے، ایک دعوت ہوتی ہے، کہ ہے کوئی جو حسن کی جزئیاتی علامتوں کے سہارے حسنِ کامل سے وہ لذت آشنائی حاصل کرلے جو دو عالم سے دل کو بیگانہ کرکے ایک وجودِ یگانہ سے قریب کردیتی ہے۔ بتادے کہ جزء کا حاصل یہی ہے کہ وہ کُل میں سما جائے۔

یہ سارے احساسات' اسی کتاب ''سرگوشی'' کی دین ہیں۔ کتابیں اچھی بری مسلسل شائع ہورہی ہیں، طباعت کا بھی معیار بلند سے بلند تر ہوتا جارہا ہے، مگر کتاب ''سرگوشی'' کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ ظاہری حیثیت سے اتنی دلکش، خوبصورت، دیدہ زیب اور آراستہ پیراستہ کتابیں اردو میں تو گویا نایاب ہیں؛ لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ کتاب اپنے پاکیزہ معصوم اور سچے جذبات و خیالات اور نہایت پُراثر انشا پردازانہ اسلوب کی وجہ سے اردو کے پاکیزہ اور اسلامی ادب کے خزانے میں بیش قیمت اضافہ ہے۔ ان خیالات میں مبالغہ آمیزی یا بے جا مداحی کی گنجائش اس لیے نہیں کہ مقدمہ میں بڑی سچائی، اور کہنا چاہئے بھولے پن سے لکھا گیا:

> ''سب لوگوں کی طرح مجھے بھی زندگی کے شیریں و تلخ تجربات سے سابقہ پڑا، جنھوں نے بہت کچھ سکھایا، اور مجھ ناچیز کو میرے رب سے قریب کردیا۔ یہ سارے مشاہدات، احساسات، تجربات، سپردِ قلم ہوتے رہے، اور لکھتے وقت یہ احساس ہونے لگا کہ میں نہیں؛ بلکہ کوئی اور لکھوا رہا ہے۔ میں تو صرف کاتب ہوں۔''

جب لکھنے والا اس کیفیت سے گذرنے لگے کہ قلم و کاغذ کی گزرگاہ میں جو اس کے ہمراہ ہے اور قریب تر ہے، وہ کوئی اور نہیں اس کا رب ہے، اور یہ اسی کا کرم ہے کہ قلم کو رفتار ملی ہے، تو پھر قدرت اور فطرت کا مطالعہ، حسین مناظر، چرند پرند، پیڑ پودے، پھول پتے، یہاں تک کہ ننھے منے کیڑے مکوڑوں کے لیے حرفِ شکر یہ زبان پر لادیتا ہے، کہ یہی وہ مظاہر ہیں جن سے صرف

چاہت ہی نہیں' لکھنے کا ہنر بھی آتا ہے اور پھر دل کا یہ اعتراف لفظوں میں ڈھل جاتا ہے کہ ''یہ خالقِ کائنات کا بڑا احسان ہے''۔

''سرگوشی'' کا پہلا صفحہ 'اندازِ تکلم' سے شروع ہوتا ہے، اور اسی حرفِ مبتدا سے باقی سارے مضامین کی خبر مل جاتی ہے۔ جملہ یا چند جملے ہیں کہ:

''فطرت کو زور سے بات کرنے کی عادت نہیں، اس کا اندازِ تکلم' اندازِ سرگوشی ہی ہے۔ تم سننے کی عادت ڈالو''۔

''سرگوشی'' کے عنوان کی یہ مختصر سی توجیہ، بلاغت کے کمال کی مثال نہیں تو اور کیا ہے؟!!۔

اختصار کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ:

''میری خوش نصیبی کہ تو نے مجھے حمد کرنا سکھایا''۔

ایک اور سرگوشی جس میں حیرت اور معصومیت مل کر سرگوشی کرنے والی ذات کو قربت کا تحفہ دینے کا فیصلہ کرا دیا تی ہے۔ کیسی ہے یہ سرگوشی کہ:

''ربا! تو بھی یار اتنی بڑی چھت بنائے، نہ آر نہ پار، ایک جیسی، نہ کوئی سوراخ، نہ شگاف۔ اس پر طرّہ یہ کہ موسم میں رم جھم، رم جھم برساتی ہے، اور یہ بارش جب رکتی ہے تو چھت ویسی کی ویسی، نہ کوئی سوراخ، نہ کوئی شگاف۔ مجھے حیرت میں ڈالے ہے، حیرت والی حیرت''۔

اس دنیا کے بنانے والے کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے صبح ہی کا منظر کافی سمجھا گیا۔ شفق کے چہرہ پہ رنگوں کی بہار کا نظارہ تو کافر سے کافر نگاہ کو بھی چشمِ بینا میں بدل دے۔ بس اس کے لیے چشمِ تصور کے پاک اور روشن ہونے کی ضرورت ہے، جو یہ کہہ دے کہ:

''مصور میں نے تیرے موئے قلم کو حرکت میں دیکھا۔ دیکھا کہ تو نے ہلکے نیلے، سفیدی مائل سطح پر اودے اودے رنگ کے مختلف زاویے کھینچے، کچھ چھوٹے کچھ بڑے، اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے۔ اس بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ پھر ان زاویوں میں سنہرا اور روپہلا رنگ، ایک ایک کر کے سب خاکوں میں وہ چمکتا رنگ آ گیا، ایک ایسی چمک کہ آنکھوں میں نور اُتر آیا..... میرے مصور! تیرا واقعی جواب نہیں۔ نت نئے رنگوں سے کھیلتا ہے، ہمارا جی بہلاتا ہے۔ تیری شفق کے میں قربان، تیرے موئے قلم کو میرا اسلام''۔

'ھُو المُصَوِّر' کی ایسی تصویر کشی' آخر اس اعتراف پر لے آتی ہے کہ ''خوش بخت ہیں وہ آنکھیں جو یہ نمائش دیکھ پاتی ہیں''۔

سرگوشی کا یہ انداز بڑی حد تک انشا پردازانہ ہے۔ انشا پردازی' ادب کی وہ صنف ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ تخلیقی امکانات کی بڑی گنجائش ہے۔ متوازن اور متناسب تحریریں! تلاش کیا جائے تو انشائیہ کی داخلی کیفیت یا جدت نظر آ جاتی ہے، اور یہ تو قطعی برحق ہے کہ

انشائیہ میں شعر کے حسن اور نثر کا رکھ رکھاؤ' تحریر کو وہ قوت بخشتا ہے جو عالمِ سرگوشی میں دل کی باتوں کے اظہار کی ہمت عطا کرتا ہے۔

سرو کے درختوں سے سب واقف ہیں؛ مگر جب دل کی نظر ان پر جاتی ہے تو:

''ہاں دیکھا ربا! میں نے تیرے سرو کے درختوں کو دیکھا۔ کیا قد ہے! کیا قامت! کیسے پُر وقار صف باندھے کھڑے ہیں۔ تو چاہتا ہے اور میری بھی خواہش ہے کہ یوں پُر وقار زندگی گزاروں، مگر پھر اس کے لیے قد بھی تو عنایت ہو ربا!۔ اپنے باطن کا قد بلند کرو، ظاہر کا خود بخود ہو جائے گا''۔

ہاتھوں کی لکیریں باتیں کریں تو انشائیہ ہی ہاتھ لگتا ہے:

'' کام کرتے کرتے نگاہ ہتھیلی کی پشت پر پڑی، جسے کبھی تیرا لمس میسر ہوا تھا، بڑا صاف ستھرا، مرمریں ہاتھ، اب جو غور سے دیکھا تو اس پر کئی نقش و نگار ہیں، کسی کے موئے قلم نے باریک باریک لکیروں سے خوب صورت ڈیزائن بنایا، سمجھنے کی کوشش کی مگر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صرف خوب صورت نقش و نگار ہیں یا وقت نے زندگی کی داستان، میری سوانح عمری رقم کی ہے.....''۔

اور انشائیہ پھر سرگوشی میں کیسے بدل جاتا ہے:

''حیرانی ہوتی ہے جب دکھائی دیتا ہے کہ تیری وسعت کا کوئی کنارہ نہیں۔ وہ جو زمین و آسمان، کون و مکان میں نہ سما سکے، میری خوشی کی خاطر میرے ننھے سے دل میں سما جاتا ہے، آن بیٹھتا ہے، میری دل جوئی کرتا ہے''۔

ہر صفحہ پر کچھ مختصر، کچھ ذرا پھیل کے، بس یہی باتیں کسی نہ کسی عنوان کے سایہ میں بکھری ہوئی ہیں۔ قریب دو سو بارہ صفحات کی تحریر میں ایک سو اسی سرخیاں لیے ہوئے۔ ہر سرخی کا جدا رنگ۔ جس کی مہک بھی الگ، جس کی چمک بھی الگ۔ 'سنی ان سنی' کی سرخی اور مضمون ایک سطر میں:

''جب جب تیری سنی ان سنی کر دی، کس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں میں نے''۔

ایک اور عنوان ''نفسِ ناداں'' ہے:

''اس قدر نادانی! یہ جانتے ہوئے بھی کہ ساری حمد و ستائش اسی کے لیے ہے۔ تم اپنی تعریف سننے کے لیے بے چین رہتے ہو۔ قلم اس کا، دوات اسی کی، ہدایت اس کی، عقل اسی کی دی ہوئی۔ پھر تمھارا کیا ہے؟ سکھایا سب کچھ اسی نے، تم نے صرف صفحۂ قرطاس پر ڈال دیا، اور اسے اپنی تحریر کہہ کر خود کو تعریف کا مستحق سمجھنے لگے۔ جو کام کیا اُسے اپنی طرف منسوب کیا۔ نادانی ہی نادانی''۔

ایک اور سرگوشی، جس میں نہ دید کی تمنا، نہ آرزوئے وصال، بس ایک خواہش کہ:

''میرے دن رات ایسے ہوں کہ بس تو کہے اور میں کروں، تو کہے اور میں کروں۔ میرا لمحہ لمحہ ربّا زندگی لیے ہوئے ہو.....کسی قدر خوش نصیب ہوں گے وہ لمحے جو تیری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گزریں گے۔ کہہ دے ربّا!' کذلک'، ہاں ایسا ہی ہوگا''۔

انسان کی معراج اپنی حقیقت کے عرفان میں ہے:

''میں اپنی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ میں ایک حقیر ٹھیکری ہوں؛ لیکن جب اس نے مجھے اپنے ہاتھوں میں لیا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھ میں اپنی روح پھونکی تو اللہ اللہ! میرا رتبہ کس قدر بڑھ گیا۔ اشرف المخلوقات میں شامل' اب اگر میں اپنے فرض کو نہ پہچانوں، اسے نہ نبھاؤں تو حیف ہے مجھ پر۔ پھر ٹھیکری' نری ٹھیکری ہی رہی''۔

'حبل اللہ'، اللہ کی رسی کا ذکرِ عام ہے؛ لیکن اس کا مفہوم کس طرح صاحبِ شعور کو خاص بناتا ہے:

''تیری چڑیاؤں کو دیکھا۔ چھوٹی چھوٹی چڑیائیں بھی اپنے پتلے اور نازک پاؤں سے شاخوں کو کس قدر مضبوطی سے تھامے رہتی ہیں، اور یہ انسان اتنے بڑے بڑے طاقت ور ہاتھ رکھتے ہوئے تیری رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑ پاتا، اور بسا اوقات گر جاتا ہے''۔

نگاہوں میں یہ حقیقت بھرے الفاظ سما گئے کہ 'ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح' تو زبان پر یہ جملہ آ گیا:

''تو نے کہا ربّا کہ: ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں سے سجایا ہے۔ میرا جی کرتا ہے کہ میں اپنی جبیں کو تیرے سجدوں سے سجالوں''۔

ہر صفحہ اسی قسم کی سرگوشیوں سے سجا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے جملے۔ لیکن بڑی بڑی باتیں۔ ہر صفحہ دامنِ دل کو کھینچنے میں کامیاب کہ جو اس میں ہے' قدر کرنے کے قابل ہے۔

کتاب کے اس ہلکے پھلکے تعارف میں ان کا ذکر نہیں آیا جن کی پاکیزہ فکر نے قلم و کاغذ کو ایسی طہارت و نظافت بخشی۔

کتاب کا گرد پوش اگر ایک چلمن ہے تو پس پردہ چند جھلکیاں بتاتی ہیں کہ سرگوشی میں مصروف شخصیت' امریکا اور یوروپ کی فضاؤں کی پروردہ ہیں۔ اردو زبان و ادب کی اعلیٰ اور با مقصد اور فیض رساں روایات کی قتیل ہیں، اور ان روایات سے امریکا اور یوروپ سے آشنا کرانا چاہتی ہیں، اور اس عمل کو وہ رضا کارانہ یا دوسرے الفاظ میں اپنے ربّا کی خوشنودی کے لیے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کتاب خوبصورت مظاہر قدرت کے ذریعہ خالق فطرت سے جس طرح ہم کلامی کا لطف بخشتی ہے' اس میں واقعی استجابیت ہے، اور یوں ہے کہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے اور آئی آئی ٹی گاندھی نگر جیسے مستند و موقر اداروں میں تکنیکی تدریس کے دوران' انھوں نے آئی آئی ٹی میں 'اردو چیر' قائم کردی۔

لیکن سب سے قابلِ قدر بات یہ کہی گئی کہ اردو ادب اور اخلاقی (ہمارے نزدیک اسلامی) اقدار پر مبنی ان کی تحریریں، فکر کی پختگی، تہذیبِ انسانی کے شعور اور معاشرتی ذمہ داری کی آئینہ دار ہیں۔

'سرگوشی' میں جب اس قسم کی تحریریں بار بار نئے رنگ اور نئی خوشبو میں روح کے نشاط کا سامان بنتی ہیں تو فکر و نظر کے گلشن میں جیسے بہاریں چپکے سے نہیں' صبا و نسیم سے بے حجابانہ اٹھکیلیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ لطف و لذت کی ایک بار پھر تجدید ہو۔

''تم ان سیاہ لفظوں میں کیا تلاش کر رہی ہو؟ دیکھو، وہ دیکھو! پہاڑ کے پیچھے سے رنگ اور روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ یہ لو! یہ روشنی تمہیں سب کچھ دکھا دے گی، سمجھا دے گی، اور سچائی سے آشنا کر دے گی۔ قدرت خود ایک بڑی درس گاہ ہے''۔

''آج میرا جی نہ تسبیح پڑھنے کو چاہ رہا ہے، نہ ارکانِ عبادت ادا کرنے کو، نہ مانگنے کو، بس جی چاہتا ہے کہ خاموش تیرے پاس بیٹھی رہوں، تجھے دیکھتی رہوں، نہارتی رہوں، ترے وجود میں کھو جاؤں''۔

لکھنے والے کو جب یہ احساس ہو کہ وہ لکھتا نہیں، کوئی اس سے لکھواتا ہے، تو پھر یقین کرنے نہ کرنے والے ذہن کے سوالات کے بارہ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

''میں کیا جواب دیتی؟ محبت کے سب راز کھل جاتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تجھے دروغ گوئی بالکل پسند نہیں ..... ۔ یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہاں لکھوں گی''۔

'اسم اللہ' کی سرخی میں شامل یہ چمک بھی کیسی پیاری ہے:

''جب اس کے پیارے پیارے نام لو تو خود ویسا ہی بننے کی کوشش کرو، جب 'العزیز' کہو تو اپنے میں وہ قوت، وہ توانائی محسوس کرو۔ جب 'الرحیم' کہو تو رحمت کو اپنے اوپر لازم کر لو۔ جب 'الودود' کہو تو تمہارا انگ انگ، پور پور محبت سے سرشار ہو جائے، اور پھر یہ خلوص کی دولت تقسیم کرتے پھرو۔ اس کے نام لو تو بڑے احترام سے''۔

''ربّا! دل اس بات سے کس قدر مطمئن ہے کہ 'تو' اس دن کا مالک ہے۔ تو جو رحمن و رحیم ہے۔ یہ بات ہم گنہ گاروں کے لیے یقیناً باعثِ سکون ہے، کہ تو اور صرف تو 'اس دن کا مالک ہے''۔

ایک اور مختصر سی سرگوشی پر کان لگانے کی ضرورت ہے:

''ربّا! آئی تو تیرے حضور میں ہوں، مگر دماغ کہیں بھٹکتا ہے، اور دل کہیں۔ تیرے پاس ہو کر بھی پاس نہیں ہوتی''۔ ''مگر میں تو تیرے پاس ہوں''۔

قرآن مجید کو 'کتابِ حمید' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے ان سرگوشیوں کی ہمت افزائی کی ہے جو نیکی اور جذبۂ عمل کی پاکیزگی کی غماز ہوں۔ اس کتاب سے یہی نکتہ عیاں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بھی خصائلِ حمیدہ میں شمار کے لائق ہے۔ کہنے کی کیا ضرورت کہ مصنفہ کا نام حمیدہ ہے۔ محترمہ حمیدہ بانو۔

برمحل نیز ضرب المثل اشعار

﴿مولانا انیس احمد ندوی۔استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء،لکھنؤ﴾

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، اس میں ہم اپنی زندگی کے مختلف رنگ و آہنگ دیکھ سکتے ہیں، اس میں انسانی زندگی کے احساسات، تجربات، مشاہدات و واقعات کی ترجمانی ملتی ہے، خاص طور پر شاعری اور شاعری میں بھی غزل میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں اور آلام روزگار کی عکاسی اور ترجمانی پائی جاتی ہے، انسان زندگی میں طرح طرح کے حالات سے دو چار ہوتا ہے، کہیں وہ حادثات کا شکار ہوتا ہے، کہیں وہ عشق میں ناکام ہوتا ہے، محبت میں دھوکا کھاتا ہے، اپنوں کی طوطا چشمی، بیوفائی اور بدعہدی کا شکار ہوتا ہے، کہیں وہ کامیابیوں پر خوش ہوتا ہے اور کبھی اپنی حرماں نصیبی پر آنسو بہاتا ہے، غرضیکہ آلام روزگار، غم عشق، ہجر و فراق کی بیتابیاں، وصل و ملن کی آس و پیاس، محبت کی ناکامیاں اور اس کے نشیب و فراز، تاریک ذہنیت، تعصب و نفرت، عدم رواداری اور تنگ نظری وغیرہ یعنی قسم قسم کی مشکلات و پریشانیوں سے دو چار ہوتا ہے، خوشیوں کے شادیانے بجتے ہیں اور غم کی نوحہ خوانی بھی، عزم محکم کے ترانے گائے جاتے ہیں اور اور حرب و ضرب کے نغمے بھی، بچوں کی چہلیں اور کلکاریاں بھی اور بڑے بوڑھوں کی آہ و کراہ بھی، اور شاعر جب ان حالات و کیفیات کو شاعری کے پیکر میں حسن ادا کے ساتھ بیان کرتا ہے تو لوگ اسے اپنی کہانی سمجھنے لگتے ہیں، انھیں اس میں اپنے غم کی روداد، واردات قلب کی یا اپنے تجربات، جذبات و احساسات کی ترجمانی لگتی ہے اس لیے ایسا شعر آسانی سے یاد ہوجاتا ہے یا یاد کرلیا جاتا ہے اور یہ ترجمانی پیکر غزل میں ہوتی ہے جس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے اور جسے ریزہ کاری کا نام دیا گیا ہے، اور دیگر اصناف میں بھی، اسی احساس کو ایک شاعر نے اس انداز میں کہا ہے ۔

ہم اپنا قصہ درد و الم کہتے نہیں لیکن
بالفاظ حدیث دیگراں کہنا ہی پڑتا ہے

یا سیماب اکبرآبادیؔ نے اسی بات کو اس انداز سے کہا کہ

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اسی لئے بعض اشعار میں جو تجربات، احساسات، واقعات یا جذبات بیان کیے جاتے ہیں وہ معاشرہ پر اتنے صادق آتے ہیں یا لوگوں کے جذبات کی اتنی

خوبصورت ترجمانی کرتے ہیں کہ وہ اشعار جو ضرب المثل بن جاتے ہیں اور عوام وخواص میں یکساں طور پر بحیثیت مثل مشہور ہو جاتے ہیں ایسے اشعار کی دو قسمیں ہیں پہلی قسم وہ ہے جو صرف خواص کے مابین یا علمی حلقوں میں مشہور ہوئے، اور اپنی مخصوص تلمیح و اشارہ، رمز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ کے پیکر میں دیکھے جاتے رہے، ایسے اشعار کی بھی ایک طویل فہرست ہے، یہاں اس مضمون میں اس قسم کے اشعار بھی پیش کیے جائیں گے نیز دوسری قسم جو خواص و عوام دونوں میں مشہور ہوئے لیکن اپنی مخصوص معنویت کے لحاظ سے خواص سے زیادہ عوام میں مشہور ہوئے ان کو بھی پیش کیا جائے گا، اسی کے ساتھ ساتھ کچھ برمحل اشعار بھی پیش کئے جائیں گے، ایسے اشعار شاعری کی ہر قسم میں پائے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ صرف غزل ہی میں ایسے اشعار ملیں، ایسے اشعار نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، حمد و نعت، مسدس، مخمس، رباعی، شہر آشوب اور دیگر اقسام میں ملتے ہیں، بعض اشعار جو ضرب المثل کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کا صرف ایک مصرعہ مشہور ہوتا ہے جبکہ دوسرا مصرعہ غیر معروف ہوتا ہے اور گمنامیوں کے دبیز پردے میں چھپا ہوتا ہے اور اس کے حقیقی شاعر کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا، لیکن پورا شعر جاننا اور اس کے شاعر کا نام جاننا عوام نہیں تو کم از کم خواص کے لئے نہایت ضروری ہے، اسی طرح اس شعر کے متعلق جو غلط معلومات یا غلط فہمیاں لوگوں میں رائج ہیں اس کو دور کرنا اور صحیح مکمل شعر کی طرف رہنمائی کرنا اہل علم کے لئے ضروری ہے، ایسے اشعار تمام شعراء کے یہاں کم و بیش پائے جاتے ہیں، ایسے اشعار کا تعلق عموماً حقیقی زندگی، زندگی کی بے ثباتی، زندگی کے گوناگوں مسائل، معاملات حسن و عشق اور زندگی کے دیگر تجربات و احساسات اور رشتوں کی نزاکتوں سے ہوتا ہے، مال و زر کی بے ثباتی، گناہوں کی بیباکی، ظلم و جفا، ستمگری اور سفا کی جیسے موضوعات پر جب شاعر کا تخیل نزاکت و لطافت کے پیرایہ میں پہنچتا ہے تو عموماً ایسی ہی شاعری وجود میں آتی ہے جو ان مسائل میں الجھے ہوئے لوگوں کی بڑی خوبصورت ترجمانی کرتی ہے اور ایسے ہی اشعار اکثر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، جیسے مظفر وارثی کے یہ اشعار آجکل کے حالات میں بہت مشہور ہو گئے ہیں۔

ہم کریں بات دلیلوں سے تو رد ہوتی ہے
اس کے ہونٹوں کی خموشی بھی سند ہوتی ہے
کچھ نہ کہنے سے بھی چھن جاتا ہے اعجاز سخن
ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

اردو شاعری کی تاریخ میں سیکڑوں ایسے شعراء گزرے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی شعر یا کئی اشعار اس قدر مشہور ہوئے کہ وہ زبان زد خاص و عام ہو گئے، لوگ اس کا ورد کرتے ہیں اس کو اپنی تقریروں، تحریروں اور مکالموں میں بطور سند پیش کرتے ہیں، اپنے معنی، مضمون یا گفتگو کی تائید اس سے حاصل کرتے ہیں، شعر کے ایہام و تلمیح سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ظلم یہ کرتے ہیں

کہ ان اشعار کو کسی بڑے شاعر مثلاً اقبال، غالب، میر، ذوق وسودا وغیرہ سے منسوب کرتے ہیں جبکہ ان کا حقیقی خالق کوئی اور گمنام شاعر ہوتا ہے اور وہ گمنامیوں کے دبیز پردوں میں کہیں چھپا رہتا ہے ''ایسے پردے کہ ہٹاؤ تو ہٹائے نہ بنے'' ایسے اشعار کے حقیقی شاعر کے بارے میں عوام تو عوام خواص کو بھی علم نہیں ہوتا، اس لیے یہ مشہور ہوجاتا ہے کہ یہ شعر فلاں شاعر کا ہے جبکہ حقیقت میں اس کا شاعر کوئی اور ہوتا ہے، مثلاً یہ شعر

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

اس شعر کو عموماً اقبال کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اسی طرح دینی و مذہبی حلقے میں جگر مرادابادی اور دیگر کئی شعراء کے اشعار ہیں جن میں اقبال کی فکر پائی جاتی ہے اس لیے انھیں اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے جو قطعاً غلط ہے، فکر کا توارد ہونا کوئی غلط نہیں لیکن خواص بھی اس میں غلطی کریں تو یہ سراسر علمی ناانصافی ہے، بہرکیف یہ شعر شہیر مچھلی شہری کا ہے، برمحل اشعار اور ان کے مآخذ کے مصنف خلیق الزماں نصرت نے حفیظ جونپوری کی شاعری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شہیر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے، امیر مینائی شہیر کو مشہور شعراء میں شمار کرتے تھے، وہ حفیظ جونپوری کے معاصرین میں تھے، شہیر صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کے دیوان کا نام خیابان ترنم ہے جس کو ان کے شاگرد سروش مچھلی شہری نے بعد میں شائع کیا۔

ایک اور شعر عوام وخواص میں بہت مشہور ہے بلکہ عوام میں خواص سے زیادہ مشہور ہے، خواندہ ناخواندہ سبھی حضرات ایک دوسرے کو سناتے رہتے ہیں اور اس کے شاعر کے بارے میں اہل علم بھی بے خبر ہیں، وہ شعر یہ ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

یہ شعر بہت سے لوگ مثل مرضی مولی از ہمہ اولی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، یہ شعر برق لکھنوی کا ہے، اتر پردیش اردو اکیڈمی سے آغا محمد باقر کی مرتب کردہ کتاب غزلیات برق ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی اس میں اس شعر کا ذکر ملتا ہے، خلیق الزماں نصرت نے بھی تحقیق کے بعد یہی رائے پیش کی ہے، برق ناسخ کے شاگردوں میں تھے، یہ بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔

سراج اورنگ آبادی کے یہاں تغزل اور تصوف دونوں نہایت خوش رنگی کے ساتھ پائے جاتے ہیں، فرماتے ہیں

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا
سراپا موم ہو یا سنگ ہوجا

(کلیات سراج اورنگ آبادی صفحہ ۳۴۲، غزل نما صفحہ ۱۵۰)

لکھنؤ کے شعراء میں ثاقب لکھنوی کو کون نہیں جانتا، انکی زندگی اور شاعری دونوں نشیب وفراز کا شکار رہی، میر وغالب کی پیروی کرتے تھے، لکھنؤ کے شعراء کے ساتھ برسرپیکار رہے، ان کے اور لکھنؤ کے شعراء

کے درمیان بڑی شدید چشمک رہتی تھی، ان کا ایک مشہور شعر زبان زد خاص و عام ہے، خاص طور پر اس شعر کا دوسرا مصرعہ وہ شعر یہ ہے۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ثاقب لکھنوی کے اشعار میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے کیونکہ شعر کہنے کے سلسلہ میں ان میں بڑی محویت پائی جاتی تھی، دنیا و مافیہا سے بیخبری پائی جاتی تھی اس لیے ثاقب کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے، مندرجہ ذیل اشعار لوگوں میں بہت مشہور ہیں۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

قسمت تو دیکھ ٹوٹی جا کر کہاں کمند (دیکھئے کہ)
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا،

دوسری قراءت

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

(قائم چاند پوری، کلیات قائم ص ۴، مخزن نکات ص ۹)

شعلہ بھڑک اٹھا میرے دل کے چراغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(پنڈت مہتاب رائے تاباں، بحوالہ تذکرہ آثار الشعراء ہنود، مرتبہ دیبی پرشاد مطبع رضوی دہلی ۱۸۸۵)

اس شعر کو ایک اور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(پنڈت مہتاب رائے تاباں)

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

دوسری قراءت:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے امیر و لے/ و لے اے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

(آوارہ گرد اشعار صفحہ ۹۲، طبقات الشعراء صفحہ ۴۲۲)

بقول دسنوی یہ امیر مینائی کا شعر ہے اور میر کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ شعر نہ میر کا ہے نہ امیر کا، بلکہ نواب یار محمد خاں امیر (ٹانڈہ) کا ہے

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(میر حسن، مثنوی سحر البیان صفحہ ۱۲۳)

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
یہ نسخہ ہے کم خرچ بالا نشیں

(میر حسن)

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی چلتی نہیں

(میر حسن، مثنوی سحر البیان صفحہ ۱۲۳)

جان و دل ہیں اداس سے میرے
اٹھ گیا کون پاس سے میرے

(میر حسن، گلشن ہند صفحہ ۹۴)

شیخ محمد ابراہیم ذوق خاقانی ہند اور ملک الشعراء خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے، ذوق میں شاعری کی خداداد اور غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی تھی، ذوق اپنی متانت و سنجیدگی، تخلیقی صلاحیت نیز مزاج کی وجہ سے عوام و خواص دونوں میں یکساں مقبول رہے، اس وقت شاعری کے دو اہم مراکز تھے، حیدرآباد اور لکھنؤ، بہت سارے شعراء لکھنؤ اور حیدرآباد منتقل ہو گئے لیکن استاذ ذوق دہلی ہی میں جمے رہے اور یہ شعر ان کی مستقل مزاجی استقامت اور سنجیدگی پر دلالت کرتا ہے:

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

استاذ ذوق کے یہاں سلاست، روانی، شگفتگی پائی جاتی ہے، روزمرہ کا خوبصورت اور برمحل استعمال، اس دور کی تہذیبی قدروں کی سنجیدہ عکاسی، صنائع اور بدائع سے شعری جہات میں رنگینی و رعنائی پیدا کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات میں شامل ہے، اور انہیں شعری امتیازی خصوصیات کی بنا پر ان کے سیکڑوں اشعار ضرب المثل کی حیثیت سے لوگوں میں شہرت پا گئے، ملاحظہ فرمائیں:

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق! اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اے ذوق اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار، یا اسے رو کر گزار دے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا، تو کدھر جائیں گے

یہ اقامت، ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی، موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

کھل کے گل کچھ تو، بہار اپنی صبا، دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

(پہلے مصرعہ میں ایک قراءت اس طرح ہے):

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

مرے نالوں سے چپ ہیں، مرغ خوش الحاں زمانے میں
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانے میں

ہم رونے پہ آجائیں، تو دریا ہی بہادیں

شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکہ اور مدینے

مندرجہ ذیل شعر فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خان برق بن کاظم علی خان کے ہیں

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں تجھے عاشق ترا پکار آیا

(غزلیات برق صفحہ ۳۷)

مندرجہ ذیل اشعار خواجہ محمد وزیر تخلص وزیر لکھنوی کے ہیں، والد کا نام خواجہ محمد فقیر تھا، لکھنؤ میں پیدا ہوئے اس لیے وزیر لکھنوی کہلائے، پہلے آتش سے اصلاح لی بعد میں ناسخ کے شاگرد ہوئے۔

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

(تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۷۲، انتخاب سخن ص ۲۲۲)

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے ہیں
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہوکر

(چمن بے خزاں ص ۱۴۱، انتخاب سخن ص ۱۰۷)

جو خاص بندے ہیں وہ بندہ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

(غزل نما ۳۶۶، انتخاب سخن ص ۲۲۱)

نواب سید محمد خان رند بن سراج الدولہ نواب غیاث احمد، رند لکھنوی، لکھنؤ کے معروف و مشہور شاعر تھے، آتش کے شاگرد تھے، ذیل میں دئے گئے اشعار رند کے ہیں۔

(گلدستہ عشق معروف بدیوان رند طبع منشی نولکشور، لکھنو)

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
سیر کی، خوب پھرے، پھول چنے، شاد رہے
باغباں جاتے ہیں، گلشن تیرا آباد رہے
پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر
چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

(رند لکھنوی، گلدستہ عشق ص ۵۳)

مولانا محمد علی جوہر مشہور صحافی، مجاہد آزادی صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز اور شاعر تھے ان کے بھی بہت سے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ان میں یہ اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو

(تحریک خلافت کی تائید و حمایت میں)

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسرت موہانی عظیم مجاہد آزادی، شاعر و ادیب تھے ان کے بھی بہت اشعار لوگوں میں اس قدر مشہور ہوئے کہ زبان زد خاص و عام ہو گئے، ان میں یہ اشعار

جوانھوں نے قید بامشقت کے دوران کہا تھا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی
کٹ گیا قید میں ماہ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

اسی طرح دیگر اشعار

توڑ کر عہد کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہوجائیے
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں
نہیں آتی تو ان کی یاد مدت تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

(لوگوں میں مشہور مہینوں تک نہیں آتی ہے)

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں، بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
بڑے پاک طینت بڑے پاک باطن
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

(ریاض خیرآبادی)

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

(مرزا محمد علی فدوی)

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

(احمد حسین امیر اللہ تسلیم)

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہ شعر میر تقی میر کا نہیں ہے بلکہ فکر یزدانی رامپوری کا ہے، ان کا نام الطاف الرحمن تھا، تخلص فکر یزدانی ہے، راز یزدانی رامپوری کے شاگرد تھے، والد کا نام مولوی حبیب الرحمن تھا۔

منولال صفا لکھنوی مصحفی کے شاگرد تھے، ان کے والد کا نام رام پورن چند تھا، تذکرہ گلشن بے خار صفحہ ۹۳۹ پر منولال صفا لکھنوی کا ایک شعر لکھا ہے۔

چرخ کوکب یہ سلیقہ ہے دل آزاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

آصف جاہ ششم میر محبوب علی خان دوسرے علوم و فنون کے ساتھ ساتھ عربی، اردو، فارسی انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے، رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے کہ میر محبوب علی خان آصف تخلص فرماتے تھے اور اپنے استاذ داغ دہلوی کے متبع تھے، دو دیوان یادگار ہیں، مندرجہ ذیل شعر اصلاً انھیں کا ہے۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

اس شعر کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ فیض کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر محبوب علی خان آصف سادس نے لکھا اور یہ ضرب المثل بن گیا، مالک رام نے غبار خاطر کے اشعار کی تخریج کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اسی رائے کا اظہار غبار خاطر صفحہ ۲۹۶ پر بھی کیا ہے۔

وحشت کلکتوی کا شمار کلکتہ کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے، مست کلکتوی کو وحشت کی طرح شہرت حاصل نہ ہوسکی گرچہ وہ ایک خوش فکر شاعر تھے لیکن ان کے بعض اشعار اتنے مشہور ہوئے کہ لوگوں میں ضرب المثل بن گئے، خلیق الزماں نصرت نے شعرائے بنگالہ کے حوالہ سے اپنی کتاب میں انھیں نقل کیا ہے۔

سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد
رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد
حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے
مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے
وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

(وحشت کلکتوی)

میر حسین نام تخلص تسکین فرماتے تھے، شاہ نصیر سے اصلاح لی بعد میں مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے، ان کا ایک شعر ضرب المثل بن گیا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(تسکین دہلوی)

ذیل میں دیا گیا شعر منشی میاں داد سیاح کا ہے، ان کے والد کا نام منشی عبداللہ خان تھا، انھیں غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، مرزا غالب نے سیاح کو سیف الحق کا خطاب دیا تھا، تخلص سیاح تھا، ان کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے۔

قیس صحراء میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

(سیاح)

قربان علی بیگ سالک نے مومن کی شاگردی اختیار کی اور مومن کے انتقال کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص فرماتے تھے، ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے جو ضرب المثل بن گیا۔

تنگدستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے

چونکہ غالب کے شاگرد تھے اس لیے ان کے کلام میں غالب کا اثر پایا جاتا ہے، اور مندرجہ بالا شعر بھی غالب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ شعر غالب کے دیوان میں نہیں ہے، اصلاً یہ شعر سالک حیدرآبادی کا ہے۔

اسی طرح بہت سارے اشعار ایسے ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں لوگوں میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں لیکن ان کے اصل خالق کا نام یا تو نامعلوم ہے یا غلط مشہور ہے، ذیل میں کچھ مشہور اشعار شاعر کے نام کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں

اسی غزل کا ایک اور پسندیدہ اور برمحل شعر۔

ایک تو شب فراق کے صدمے ہیں جاں گداز

اندھیر اس پہ یہ ہے کہ ہوتی سحر نہیں
(حیرت الہ آبادی)

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں
(ظہیر دہلوی)

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے
(سعید احمد ناطق لکھنوی)

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
(لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی)

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

خواجہ میر درد جن کے یہاں تصوف کا غلبہ ہے، عشق ومحبت کی واردات، محبت کے احساسات وجذبات کی نہایت حسین ترجمانی ہے، میر تقی میر نے بھی نکات الشعراء میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا ہے، آغاز جوانی میں وہ بھی ایک دنیادار کی طرح زندگی گزار رہے تھے بعد میں اپنے والد خواجہ ناصر عندلیب کی مسند ارشاد پر متمکن ہوئے اور مکمل طور پر تصوف کی راہ پر چل نکلے، ان کے بہت سے اشعار اس قدر مشہور ہوئے کہ زبان زد خاص وعام ہو گئے، ان کا یہ شعر

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

اسی طرح یہ شعر بھی جس کو لوگ درد ہی طرف منسوب کرتے ہیں، حقیقت میں یہ شعر اختر انصاری کا ہے:

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

(زبان زد اشعار میں حسن الدین احمد نے اس شعر کو اختر انصاری دہلوی سے منسوب کر کے ذکر کیا ہے، ریختہ کے مطابق بھی یہ شعر اختر انصاری ہی کا ہے)

درد کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں سادگی، سلاست، صفائی نیز اسلوب ومعانی کا بڑا خوبصورت بانکپن پایا جاتا ہے، ان کے بہت سارے اشعار نہ صرف یہ کہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں بلکہ سہل ممتنع کی بھی مثال ہیں، درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو / نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
اس کی ایک قراءت ہے (نہ جا ابھی)

ارض و سماں کہاں تیری وسعت کو پاسکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اس آخری شعر میں فرمارہے ہیں کہ اب آخری وقت

قریب ہے، ایسے میں شراب کا یعنی شراب معرفت کا سہارا لینا ہی زندگی کو با مقصد بنا سکتا ہے، درد فرماتے ہیں۔

سادگی میں کس قدر معنویت اور تخیل کارفرما ہے

''بجلی سی لپک جائے ہے انداز تو دیکھو''

تجھ سے مر جائیں گے تو مر جائیں
جان ہے تو جہان ہے پیارے

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

جتنی بڑھتی ہے اتنی گھٹتی ہے
زندگی آپی آپ کٹتی ہے

علاج درد سر صندل ہے لیکن
ہمیں گھسنا ہی اس کا درد سر ہے

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آگیا

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت
دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت

بہادر شاہ ظفر بھی ان شعراء میں ہیں جن کے کئی اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے، یہ اشعار چونکہ اپنے اندر ایک تاریخ پنہاں رکھتے ہیں اس لیے زبان زد خاص و عام ہو گئے، ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

گلستان ہزار رنگ صفحہ ۳۵ نیز کلیات ظفر (اول) صفحہ ۴۱۵ میں مذکورہ شعر ذرا مختلف انداز سے ذکر کیا گیا ہے

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

(شعر میں سقم اور فکری جھول ہے)

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل، کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

صبح کے تخت نشیں، شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(بہادر شاہ ظفر)

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

(امیر مینائی)

بتوں کی بھی یہ یاد دو روز ہے
ہمیشہ رہے نام اللہ کا

زبان زد اشعار میں حسن الدین احمد نے اس شعر کو شاہ مبارک آبرو سے منسوب کر کے ذکر کیا ہے، ریختہ کے مطابق یہ شعر میر محمد سجاد تخلص سجاد کا ہے جنھیں سجاد اکبر آبادی کے نام سے جانا جاتا ہے چونکہ انھیں شاہ مبارک آبرو سے شاگردی کا شرف حاصل تھا اس لیے شاید یہ مغالطہ ہوا ہے، ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہ شعر میر تقی میر کا ہے نہ ہی غالب کا، اس طرح کے بہت سے اشعار عام طور پر غلط نسبت کے ساتھ گردش کرتے رہتے ہیں)

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا
(رضا تھانیسری)

اس شعر کے اصل خالق رضا تھانیسری ہیں جن کا پورا نام مولوی ضیاء الدین رضا المعروف رضا تھانیسری ہے، تخلص رضا فرماتے تھے اور رضا تھانیسری کے نام سے معروف تھے، مولوی شاہ امام بخش تھانیسری سے مرید تھے، یہ شعر بھی مختلف شعراء سے منسوب کر دیا جاتا ہے جس میں امیر مینائی یا حالی خاص ہیں، اصلاً اس طرح کے مضامین کا توارد ممکن ہے کئی شعراء کے یہاں ہوا ہو یا مضمون کی ہلکی پھلکی تبدیلی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو، اسی شعر کو مولوی عبد الرضا رضا کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا
(نامعلوم)

مذکورہ بالا شعر کے شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا، یہ غالب کا ہے نہ ہی میر و جلیل مانک پوری کا، چونکہ غالب اور میر کے دیوان میں نہیں ہے اس لیے اس کے شاعر کے متعلق احتیاط کرنا بہتر ہے، یہاں یہ شعر کافی مشہور اور زبان زد خاص و عام ہے کیونکہ اس میں کافی بلیغ معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔

شیفتہ دبستان دہلی کے مشہور شاعر و نقاد نیز تذکرہ نگار، مومن خاں مومن کے شاگرد تھے اور غالب کے قریبی دوستوں میں تھے، ان کی مشہور کتاب گلشن بے خار ہے جس میں شعراء کا تذکرہ ہے۔

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بد نام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ
(نواب مصطفی خاں شیفتہ)

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
(مجروح سلطانپوری)

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

حسن الدین احمد نے اس شعر کو محمد بہاء الدین بہبود علی صفی اورنگ آبادی سے منسوب کیا ہے جبکہ دوسرے اور مآخذ اس کو اکبر الہ آبادی سے منسوب کرتے ہیں، اکبر الہ آبادی کی ایک پوری غزل اسی بحر میں موجود ہے:

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

یہ پوری غزل ہی نہایت شاندار ہے لیکن اس کا ایک اور شعر بہت مشہور ہے۔

اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

مولانا ظفر علی خان اردو کے ممتاز شاعر، صحافی، اور نثر نگار تھے، ایک زبردست خطیب بھی تھے، سیاسی اور

قومی شخصیت کے ساتھ ساتھ مجاہد آزادی تھے، انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنے روزنامہ زمیندار کے ذریعہ ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
(مولانا شعر ظفر علی خانؔ)

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے جو چھپایا نہ جائے گا
(خواجہ الطاف حسین حالی)

گاہے گاہے کی ملاقات ہی اچھی ہے امیر
قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا
(امیر مینائی)

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا
(برج نرائن چکبست)

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

حسن الدین احمد نے اس شعر کو نسیم سے منسوب کیا ہے جس سے مراد نسیم دہلوی ہو سکتے ہیں کیونکہ صفی لکھنوی نسیم دہلوی کے شاگرد تھے جبکہ دیگر مآخذ میں اس کو صفی لکھنوی سے منسوب کیا گیا ہے، ریختہ اس کو صفی لکھنوی کا شعر بتاتا ہے اور اس کی تائید مولانا محمد علی جوہر کی کتاب لکھنؤ کا ادبی ماحول سے بھی ہوتی ہے، صفی لکھنوی کا اصلی نام سید علی نقی زیدی تھا ان کے والد کا نام سید فضل حسین تھا، صفی کو لسان القوم کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔

اب عطر بھی ملو تو محبت کی بو نہیں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا
(لالہ مادھو رام جوہر)

لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی جنھیں مادھو رام جوہر یا لالہ مادھو رام جوہر کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن یہ شعر ایک اور طرح سے بھی پڑھا جاتا ہے

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے جو پسینہ گلاب تھا
(اسی شاعر سے منسوب یہ قراءت بھی ہے)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
(آتش لکھنوی)

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
(مجروح سلطانپوری)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد خود ہی کریں لعنت کریں شیطان پر
(انشاء اللہ خاں انشا)

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں/امنگوں کے دن
(میر حسن)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
(اکبر الہ آبادی)

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(مرزا محمد رفیع سودا)

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
دل میں کسی کے راہ کئے جارہا ہوں میں
کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں
ہم کو مٹاسکے یہ زمانہ میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانہ سے نہیں
(جگر مرادآبادی)

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
(جلیل مانک پوری)

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی رات ہے جس کی سحر نہ ہو
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ
(جگر مرادآبادی)

دنیا میں آدمی کو مصیبت کہاں نہیں
وہ کون سی زمیں ہے جہاں آسماں نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

گھر سے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو
فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں
(داغ دہلوی)

دوسرا مصرعہ اصل ماخذ گلزار داغ میں اس طرح لکھا ہے
(جہاں بجتے ہیں نقارے وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں)
شہنائی نہیں/ نقارے
عوام وخواص میں یہ شعر اس طرح مشہور ہے۔
خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں
لیکن یہ کس شاعر کی طرف منسوب ہے یہ معلوم نہیں ہوسکا، ہوسکتا ہے داغ کے شعر کی بازگشت ہو جس کو لوگوں نے الٹ پلٹ کر کہنا شروع کر دیا

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
(واجد علی شاہ اختر)

زندگی زندہ دلی کا نام ہے، کا ہے نام
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
(ناسخ) لکھنوی

مشہور ہے کیا خاک جیا کرتے ہیں۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
(مرزا انیس لکھنوی)

(باقی صفحہ نمبر ۴۶ پر)

حسن دل ربا

مولا عبدالرحیم ندوی۔ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

تاریخ کے سینے میں کچھ عشق کی داستانیں ایسی بھی نقش ہیں جو مٹنے کے بعد بھی اپنی عطر بیزی سے روح کو معطر اور آنکھوں کو نم کیے رکھتی ہیں۔

میں نے بھی گردشِ ایام کے پردوں میں چھپی ایک ایسی ہی دلربا ہستی سے عشق کیا، مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ ایک مدت تک اس کے حسنِ بے نقاب کے دیدار کا موقع نہ ملا۔ جب میں نے اہلِ جہاں سے اس کے حالات کی جستجو کی، تو انہوں نے ایسی طلسماتی اور سحر انگیز حکایات سنائیں کہ جن کا معمولی اور ہلکا سا تذکرہ بھی سرکش سے سرکش نفوس کو اپنا اسیر بنالے اور خشک ترین و سنگ دل دلوں کو موم کردے۔

وہ اپنے عہد کے حسن و جمال کا بے مثل شاہکار اور سراپا احسان و کرم تھی؛ یہی سبب تھا کہ اس کے حریمِ ناز میں حاضر ہونے والوں کا تانتا لگ گیا اور شیدائیوں کا ایک ہجوم امنڈ آیا۔ وہ ہمیشہ اپنے آستانے پر قدم رکھنے والوں کو لطف و کرم سے نوازتی رہی، اور ہر قریب و بعید کو ایسی خندہ رو مسکراہٹ اور نگاہِ ناز سے دیکھتی تھی، جس میں مصائبِ دوراں کا تمسخر اور انسان کی بے عقلی و کوتاہ بینی پر طنز جھلکتا تھا۔

میرا یہ عشق بچپن کی معصوم رتوں کا مرہونِ منت تھا اور بچپن کا عشق روح کی گہرائیوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ میری نگاہوں نے اس کی فطرت کے اوصافِ حمیدہ کا مطالعہ کیا، اس کی پوشیدہ خوبیوں، رازوں اور بین السطور میں پنہاں معانی پر بصیرت کی نظر ڈالی، اور میری محبت اس وقت مزید شعلۂ جوالہ بن گئی، جب مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے قبل بھی کتنے ہی عشاق اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہو چکے تھے، جو اس کے حریم میں ایک لمحہ گزارنے کو پوری عمر کی سعادت اور زمانے بھر کی خوش بختی سمجھتے تھے۔

مگر میں یہ راز فاش کر دوں کہ دنیا میں عشق کی بوقلموں صورتیں ہیں، اور میرا یہ وارفتہ عشق کسی فانی محبوب سے نہیں، بلکہ سرزمینِ اندلس سے ہے!

جزیرہ نمائے آئبیریا کی اس پاک اور شاداب سرزمین پر ایک مومنِ عربی کی طرف سے ہزاروں سلام، جس کے ساحل پر اٹھارہ سالہ سپہ سالار طارق بن زیاد نے کشتیاں جلا دی تھیں اور وہ ولولہ انگیز، تاریخی خطبہ دیا تھا، جس کا ایک ایک جملہ عزم و استقلال سے لبریز، جوانمردی و جانبازی سے پُر اور ادبِ عالیہ کا

شاہکار ہے۔

چند جملے سماعت کے حوالے ہیں:

طارق نے کہا: لوگو! اب پسپا ہو کر بھاگنے کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ تمہاری پشت پر تلاطم خیز سمندر ہے، اور تمہارے سامنے خونخوار دشمن صف آرا ہے۔ ایسے کڑے وقت میں جرأت و استقامت کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں۔

خوب جان لو! کہ صدقِ دل، تسلیم و رضا اور سچی لگن ہی نصرتِ الٰہی کی شاہ کلید ہے۔

اچھی طرح کان کھول کر سن لو! اس جزیرہ میں تمہاری حالت اس یتیم سے بدتر ہے، جسے کسی کمینے کے دسترخوان پر مجبوراً بیٹھنا پڑا ہو۔

وہ دیکھو، دشمن اپنے لشکرِ جرار کے ساتھ تمہیں للکار رہا ہے۔ اسے اپنے ساز و سامان، جنگی رسد اور آہنی ہتھیاروں پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اور تمہاری کل کائنات بس یہ خستہ حال تلواریں ہیں، جن کے سوا کوئی اور سہارا نہیں۔ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تبھی نصیب ہوگا، جب دشمن کے پنجے سے اسے چھین لینے کی سکت تمہارے بازوؤں میں ہوگی۔ یہ ہرگز نہ بھولنا کہ اگر یہ بے سروسامانی طویل ہوگئی اور کوئی فیصلہ کن معرکہ سر نہ کیا گیا، تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور نصیب بگڑ جائے گا۔ دشمن کے دل سے تمہارا خوف نکل جائے گا، اور وہ مزید دلیر ہو کر تم پر پوری طاقت سے ٹوٹ پڑے گا۔

لہٰذا اس ہلاکت خیز گھڑی کے آنے سے پہلے اپنی کمر کس لو، اور اس سرکش اور ظالم دشمن کے مدِ مقابل ہونے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاؤ۔

وہ اس وقت اپنے قلعے سے باہر آ گیا ہے، تمہارے تیروں کی زد پر ہے۔ اس سنہرے موقع کو ہرگز ہاتھ سے جانے مت دو۔ اس کا ایک ایک لمحہ اب تمہاری گرفت میں آ سکتا ہے۔ بس ایک بار یہ عزمِ مصمم کر لو کہ موت کو گلے لگانا ہے۔

یقین رکھو کہ میں تمہیں کسی ایسی ہلاکت میں ہرگز نہیں ڈالوں گا جہاں میری اپنی ذات محفوظ رہے۔ نہ ہی تمہیں کسی ایسے معرکے میں تنہا چھوڑوں گا جہاں جان کے سوا داؤ پر لگانے کو کوئی اور پونجی نہ ہو۔

میں اپنے پروردگار کا نام لے کر اس معرکے کا آغاز خود کرتا ہوں۔

کان کھول کر سن لو! آج راہِ حق میں اس ذرا سی صعوبت پر کیا جانے والا صبر، دائمی راحت اور ابدی کامرانی کی پکی ضمانت ہے۔

اپنے دلوں میں کسی قسم کی بدگمانی یا غلط فہمی کو راہ نہ دینا، کیونکہ اس جگر سوز اور کٹھن جدوجہد میں شاہ و گدا کا کوئی فرق نہیں۔

طارق بن زیاد ہو یا اس کی فوج کا ادنیٰ سپاہی، سب اس امانتِ عظمیٰ کی پاسداری میں برابر کے شریک ہیں۔۔

طارق بن زیاد کی شمشیر اور بصیرت نے 711ء میں اس جزیرے کو زیرِ نگیں کیا اور اسے علم و نور کے گلستاں میں بدل ڈالا تھا۔

یہ عشق اس لیے پروان چڑھا کہ میں نے ان نفوسِ قدسیہ کے نقوشِ پا اور سیرتوں کی ورق گردانی کی، جو اس دھرتی کے اصل باسی تھے یا دنیا کے دیگر گوشوں سے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ میرے تخیل نے خارج میں اس کی ایک فردوس نظیر تصویر کشی کر رکھی تھی؛ پھر جب گردشِ وقت نے مجھے اس کے روبرو لا کھڑا کیا اور زیارت کا شرف بخشا، تو کچھ تصویریں تو عین حقیقت ثابت ہوئیں اور کچھ خواب کی طرح خیال کے پردوں میں ہی معلق رہ گئیں۔

اندلس وہ درخشاں افق تھا جہاں عربوں کے روشن تمدن کا نصفِ تاباں مکمل ہوا۔ عربوں نے اس دھرتی پر آٹھ صدیاں گزاری ہیں، جو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ تاریخ کا وہ قابلِ رشک اور زریں دور تھا، جس میں یکتائے روزگار ہستیاں، عبقری مفکرین اور عظیم شعراء و ادباء ظہور پذیر ہوئے۔ قرطبہ کی گلیوں میں جب اندلس کی راتیں علم کے چراغوں سے روشن تھیں، اس وقت پورا یورپ جہالت کی گہری تاریکیوں میں غرق تھا۔ جامع مسجدِ قرطبہ کے مرمریں ستون اور اس کی سرخ و سفید محرابیں محض سنگ و خشت کا شاہکار نہیں تھیں، بلکہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی روحانی بلندی اور فنکارانہ جمالیات کا زندہ استعارہ تھیں۔ وادی الکبیر کا بہتا ہوا پانی آج بھی ان سجدوں کی تاثیر کو پکارتا ہے، جو کبھی اس کے کناروں پر ادا کیے گئے۔ مدینۃ الزہراء کے ایوان ہوں یا غرناطہ کا قصر الحمراء، وہاں ابن رشد کی فلسفیانہ بصیرت، ابن حزم کی عشق کی گرہ کشائی اور فقہ کی گہرائی، اور ابن زیدون و ولّادہ کے دلکش اشعار نے انسانی فکر کو نئے افق بخشے۔

تہذیب و تمدن کی پروردہ کئی اقوام نے اس گلشن سے خوشہ چینی کی اور بہت کچھ اخذ کیا، مگر آج تک اندلس کے اس بلند تمدنی مقام کو نہ پہنچ سکیں۔

بحرِ محیط اور بحرِ متوسط کے سنگم پر واقع یہ شاداب خطۂ ارضی بی جو عرب کا نقطۂ اختتام اور مغرب کا نقطۂ آغاز ہے بی اس ازلی حقیقت کی کھلی اور روشن دلیل ہے کہ علوم و فنون، فکر و فلسفہ اور صنعت و حرفت میں عربوں کی فکری و عملی صلاحیت کتنی فائق تھی۔ یہ خطہ ان تمام لوگوں کے لیے صدائے موت ہے جو گروہی عصبیت اور باطنی کینے کی بنا پر تہذیبِ انسانی پر عرب اور اسلام کے احسانات کے منکر ہیں۔

مگر گردشِ ایام نے رخ بدلا، باہمی انتشار اور آپسی چپقلش نے اس درخشاں سلطنت کو گھن کی طرح چاٹ لیا، اور جب زوال کی سیاہ رات چھانے لگی تو اس گروہِ اول کو اندازہ ہوا کہ اب اس سرزمین سے کوچ کرنا پڑے گا، جہاں مغرب ان کو ''اجنبی دخیل'' سمجھ رہا تھا۔ سنہ ۱۴۹۲ء میں جب غرناطہ کا آخری چراغ گل ہوا اور ابو عبداللہ نے مڑ کر اپنے چھن جانے والے شہر کو حسرت سے دیکھا، تو وہ محض ایک اقتدار کا زوال نہ تھا، بلکہ ایک عظیم تہذیب کا المیہ تھا۔

مگر اہل مغرب مسلمانوں کو بے دخل کرنے کے باوجود ان کے صنائع، بدائع اور تمدنی شاہکاروں کو باقی

رکھنے پر مجبور ہوئے، جو مسلمانوں کے فضل وکمال کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ الحمراء کی دیواروں پر کندہ ''لا غالب إلا اللہ'' کے نقوش اور اندلس کے محلات ایسے نفیس اور پاکیزہ معانی سکھاتے ہیں، جو مغرب کی مادی لغت میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ یہ باقیات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان لوگوں کی تکذیب کرتی ہیں، جو تاریخ کے روشن چہرے پر تعصب کی راکھ ڈالنا چاہتے ہیں اور جنہیں خود غرضی نے باولا بنا رکھا ہے۔ آج بھی مغرب میں ایسے تنگ نظر موجود ہیں، جنہیں اپنی باطنی خباثت کے باعث عربوں کے فضل کا اعتراف کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے؛ وہ ان حقائق کی تصدیق سے گریزاں ہیں، جو خود ان کی اپنی معتبر کتابوں میں درج ہیں، چہ جائیکہ وہ عربی مصادر کا مطالعہ کریں۔

عربی اندلس کے آثار آج بھی ایک ناقابلِ تردید گواہ ہیں، ان کے عدل و انصاف، پختہ عقل، دور رس نگاہ اور اس بے مثال فنی مہارت کے، جو دنیا کے تمام خطوں پر فائق رہی۔ اندلس جغرافیائی نقشے پر اب چاہے کچھ بھی کہلائے، مگر انسانی تاریخ کی یادداشت اور اہلِ دل کے سینے میں وہ ہمیشہ ایک علمی جنت، ایک لازوال حسرت اور ایک ابدی عشق بن کر زندہ رہے گا۔

(یہ مضمون استاد محمد کرد علی کے مضمون ''تحیۃ الاندلس'' اور خطبۂ طارق بن زیاد کے بعض حصوں کی آزاد ترجمانی ہے)

بقیہ: برمحل نیز ضرب المثل اشعار

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

(مخدوم) ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری

دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

(جلیل)

ایسے بہت سارے اشعار ہیں جو کئی شعراء سے منقول ہیں یعنی ان کی نسبت کئی شعراء کی طرف کی جاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں تو یہ بات شاگردی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور کہیں کسی کا شعر جب کسی اور شاعر کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو لوگ اس کو اسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں ہوسکتا ہے کہ شاعر غیر معروف ہو یا صرف استاذ کے یہاں معروف ہو، بہر حال غیر معروف شعراء کا کلام جو لوگوں میں معروف ہوگیا ہو یا ضرب المثل بن گیا ہو اس کی نسبت طے کرنا ایک طویل تحقیقی عمل ہے، اگر کہیں کسی شعر کے متعلق رائے میں کچھ تضاد ہے تو مطلع فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

حوالہ جات:

۱۔ برمحل اشعار اور ان کے مآخذ: خلیق الزماں نصرت
۲۔ آوارہ گرد اشعار: قاضی عبدالودود
۳۔ ادب شناسی : صابر علی سیوانی
۴۔ لکھنؤ کا ادبی ماحول : مولانا محمد علی جوہر
۵۔ ریختہ

سیرت النبیؐ از علامہ شبلی نعمانیؒ

علمی وادبی تجزیہ

مولانا طارق ایوبی ندوی۔ مہتمم مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ

علامہ شبلی کو قدرت نے جو دماغ عطا کیا تھا، جو بلند پروازی، قوتِ تخیل اور بے نظیر قلم عطا کیا تھا، اس سے اگر وہ چند ایک مقالات ہی تحریر فرما دیتے تو وہ ان کی شہرت اور ادبیاتِ اردو کی تاریخ میں انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتے، لیکن انہوں نے اتنی متنوع تصانیف اور شاہکار علمی مباحث چھوڑے کہ جنہوں نے شبلی کی شہرت کو دوام بخش دیا۔ پھر سیرت نبی جیسی بلند پایہ تصنیف کہ جس کی مثال اردو یا دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ملتی۔ سیرت النبی محض ایک تصنیف نہیں، بلکہ ایک فکر، ایک تحریک، اسلام کا دفاع، ایک نئے طرز و منہج کی داغ بیل، ایک نئے اسلوب میں علمی تصنیف کا شاہکار اور سیرت النبی کا ایک نیا طرزِ بیان ہے۔

شبلی و سلیمان کے خوشہ چیں معروف سیرت نگار، پروفیسر یاسین مظہر صدیقی تو یہاں تک کہہ گئے:

"تاریخ و تالیفِ سیرت میں جو مقامِ امتیاز اور طرۂ افتخار شبلی و سلیمان کو حاصل ہے، وہ ان کے قدیم و معاصر ہم قلموں میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں، حتیٰ کہ ابن اسحاق و ابن ہشام بھی ان کی ہمسری نہیں کر سکتے"۔

کہنے والوں نے کہا ہے کہ شبلی نے طرز و منہج طے کیا، پھر ان کے ادبی اسلوب نے اس منہج کو بے مثال بنا دیا۔ ہونہار شاگرد نے دادِ تحقیق دی۔ شبلی نے وفورِ شوق، جذبۂ فنائیت اور کیف و مستی میں جس سیرت کی تصنیف کا آغاز کیا تھا، سلیمان نے اسی جذب و شوق سے اسے تکمیل تک پہنچایا۔

علمی تقاضے، دعوتی مقاصد اور دیگر اہداف اپنی جگہ، لیکن شبلی نے سیرت لکھنے کا جو خاکہ بنایا، اس میں ذاتِ نبوی سے شیفتگی نے اصل حسن پیدا کیا۔ عقیدت میں ڈوب کر، محبت سے مخمور ہو کر قلم اٹھانا، اور پھر دادِ تحقیق دینا، عصری اسلوب کو برتنا، پُرکشش اسلوب میں سیرت کی پرتیں کھولنا اور حیاتِ نبوی کے مختلف شعبوں کی تصویر کشی کرنا، دشمنانِ اسلام کے حملوں کا جواب دیتے جانا، علمی موشگافیوں، بد دیانتیوں کی بخیہ دری کرنا، مسلمانوں کو سیرت کے ذریعہ مغرب کے تسلط اور ذہنی غلامی سے نکالنا، فریبِ نظر سے نکال کر حقیقی منظر تک لے جانا، عیسائی مشنریوں کے مقابلہ کے لیے مواد فراہم کرنا اور مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے واقف کراتے ہوئے سیرت النبی کی تصنیف کے ذریعہ جدید علم کلام کی اساس رکھنا، دنیائے اردو کو تالیف سیرت

کے نئے اسلوب و منہج سے واقف کرانا، ایک بے نظیر علمی منہج قائم کرنا اور پھر اس پر کھرا اترنا، شبلی کا کمال ہے، اور اس کمال کا مظہرِ اتم اور شاہکار سیرت النبی ہے۔

شبلی کے تخیل اور ان کی قوتِ ارادی اور دل میں اٹھی ہوک نے انہیں اس کا احساس دلا دیا تھا، چنانچہ انہوں نے فرمایا تھا:

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم
دبیرِ چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالم قدوس سے آئی
کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

شبلی کی یہ تصنیف واقعی لازوال ثابت ہوئی۔ اس کی انفرادیت و خصوصیات، امتیازات و کمالات، علمی و تحقیقی شان کے کیا کہنے! شبلی نے سچ ہی کہا تھا کہ ان کی یہ تصنیف ان کے لیے خاتمہ بالخیر ثابت ہوئی:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سیرت النبی کو اللہ نے ایسی مقبولیت عطا فرمائی، جس کی کوئی نظیر عہدِ اخیر میں نہیں ملتی۔ اس کے اردو ایڈیشن کتنے اور کہاں کہاں سے نکلے، یہ بات حقوقِ طباعت محفوظ رکھنے والوں کو بھی معلوم نہ ہوگی۔ ایک اندازہ کرنا چاہیں تو ان معلومات سے فائدہ اٹھایئے جو ڈاکٹر الیاس اعظمی نے ''آثارِ شبلی'' میں جمع کر دی ہیں۔ تفصیلات نقل در نقل، تحصیلِ حاصل کے سوا کچھ نہیں۔

پھر سیرت النبی کا ترجمہ کن کن زبانوں میں ہوا، اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیجیے۔ ترجمہ کس نوعیت و حیثیت کا ہے، یہ بھی الگ مستقل موضوع ہے۔ انگریزی، پشتو، مراٹھی، تمل، ترکی، فارسی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ بعض زبانوں میں اس کی تلخیص تیار کر کے شائع کی گئی۔ عربی میں بھی اس ترجمے سے قبل بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے اور شائع بھی ہوا ہے۔ یہ سب تفصیلات نہایت محقق انداز میں جناب ڈاکٹر الیاس اعظمی نے اپنی کتاب ''آثارِ شبلی'' میں جمع کر دی ہیں۔

سیرت النبی ایک ایسی منفرد کتاب ہے، جس کی مثال، بقول شاہ معین الدین ندوی، عربی زبان میں بھی نہیں ملتی۔ تلاش و تحقیق، اسلوب و منہج، علمی بصیرت، مورخانہ اجتہاد، طرزِ استدلال اور روایت و درایت کی تحقیق و تدقیق نے اسے مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف بنا دیا۔ ان سب خصوصیات پر مستزاد شبلی کا دلکش، دل آویز و لطیف ادبی اسلوب اور طرزِ نگارش ہے۔ یہ شبلی کی شان بھی ہے اور سیرت النبی کی انفرادیت بھی۔ پڑھتے پڑھتے جابجا نظریں ٹھہر جاتی ہیں، دل پھڑک اٹھتا ہے۔ پڑھنے والا نہ صرف صاحبِ سیرت علیہ السلام کی محبت میں غوطہ زنی کرتا ہے، بلکہ اس کے سیرت نگار کی عقیدت میں بھی ڈوب جاتا ہے۔

شبلی نے ظہورِ قدسی کے عنوان سے جو کچھ لکھ دیا، اس کے متعدد فقروں کی تحقیق الگ موضوع ہے، لیکن اس کی

ادبیت، اس کے حسن اور اس کا والہانہ انداز اور اس کی سطر سطر سے جھلکتی ہوئی عقیدت نے اس کو لازوال عبارت میں بدل دیا۔ نہ جانے کیف و مستی، وفورِ شوق اور شدتِ جذبات کا کیا عالم ہوگا، جب علامہ کا قلم جھوم اٹھا اور نوکِ قلم سے یہ شاہکار سطریں ٹپک پڑیں۔

سیرت النبی کا مختلف حیثیتوں سے تجزیہ کیا گیا ہے، بلکہ میں نے پڑھنا شروع کیا تو حیرت ہوئی کہ اس کتاب پر لوگوں نے کس قدر لکھا ہے، کس کس ناحیہ سے لکھا ہے۔ صرف یہی نکتہ فنِ سیرت نگاری میں سیرت النبی کی اولیت وانفرادیت پر دلیل ہے۔ لوگوں نے علمی تنقیدیں بھی کی ہیں اور معاندانہ اعتراضات بھی کیے ہیں، استدراک بھی کیا ہے اور تحسین و آفرین کے بلند کلمات سے بھی نوازا ہے۔ خود علامہ کے شاگرد نے بھی تنقید و استدراک کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان استدراکات کو پروفیسر یاسین مظہر صاحب نے اسی ادارہ سے نکلنے والے مجلہ میں ''شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ، نقدِ سلیمانی کی روشنی میں'' کے عنوان سے ایک مقالہ میں جمع کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں نہ اس کا تجزیہ مقصود ہے، نہ اس کا موقع، اور نہ ازسرِ نو کچھ لکھنے کی ضرورت۔ جی تو چاہتا تھا کہ بس ظہورِ قدسی پڑھ کر اپنی جگہ لوں، لیکن حکم کی تعمیل میں سیرت النبی کی چند خصوصیات اور اس کے کچھ تعارف پر اکتفا کروں گا۔

سیرتِ نبوی ﷺ کا خاکہ

علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبی ﷺ کی تالیف سے قبل اس کے مختلف خاکے مرتب کیے اور غور و فکر کے بعد ایک جامع منصوبہ کو حتمی شکل دی۔ مقدمۂ سیرت میں اس منصوبہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے پانچ حصے ہوں گے۔ پہلے حصے میں عرب کے مختصر حالات کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں۔ اسی حصے کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ آل و اولاد اور ازواج مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔''

(سیرت النبی، ج-اول، مقدمہ ص/ ۷۰)

دوسرے حصے میں منصب نبوت، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال و اخلاق، اسلامی احکام کی تدریجی تکمیل، ان کے مصالح اور دوسرے مذاہب سے تقابلی مطالعے کو شامل کیا گیا تھا۔ علامہ کے الفاظ میں:

''دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال و اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے۔ اس حصہ میں فرائض خمسہ اور اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے۔ اس میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ

عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیوں کر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔"

(سیرت النبی-ج اول مقدمہ/ص-۷۰)

تیسرے حصے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔" (ایضا)

چوتھے حصے میں معجزات کی تفصیل پیش کرنا مقصود تھا:

"چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے۔ قدیم سیرت کی کتابوں میں الگ باب باندھے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔" (ایضا)

پانچواں حصہ یورپی تصانیف اور مستشرقین کے اعتراضات کے جواب کے لیے مخصوص تھا:

"پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے۔ یعنی یورپ نے آنحضرت اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت ﷺ کے اخلاق و عادات یا مسائل اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جواب۔" (ایضا)

اس جامع منصوبے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے پیشِ نظر صرف واقعاتِ سیرت کو جمع کرنا نہیں تھا، بلکہ سیرتِ نبوی ﷺ کو تاریخ، حدیث، قرآن، عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور جدید علمی اعتراضات کی روشنی میں ایک جامع علمی موضوع کے طور پر پیش کرنا تھا۔

افسوس کہ علامہ شبلی اپنی زندگی میں اس منصوبے کو مکمل نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی مرتب کردہ دو جلدیں شائع ہوئیں اور باقی کام ان کے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے آگے بڑھایا۔ اس موقع پر مولانا نے بڑی حسرت سے لکھا:

"مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھوں سے قوم کی نذر نہ کر سکا اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانہ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔"

(سیرت النبی-ج/ اول۔ دیباچہ طبع اول/ص ۸)

حصہ اول

سیرۃ النبی ﷺ کی پہلی جلد طبعِ جدید میں ۴۷۹ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے آغاز میں دو مقدمے شامل ہیں۔

پہلے مقدمہ میں سیرتِ نبوی ﷺ کی ضرورت و اہمیت، سیرت و مغازی اور حدیث کا فرق، فن سیرت نگاری کی تاریخ وارتقا، قدیم وجدید سیرت نگاروں کے مناہج، ان کی خوبیوں اور خامیوں کا تنقیدی جائزہ اور سیرت نگاری کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اسی میں مؤرخین وسیرت نگاروں کی بعض غلطیوں اور ان کے اسباب نیز مستشرقین کی تصانیف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، یہی مقدمہ شبلی کی وسعتِ مطالعہ، تحقیقی نظر اور تنقیدی بصیرت کی شناخت بن گیا، بلکہ اس کی اہمیت و انفرادیت کا ہر شخص نے اعتراف کیا ہے۔

دوسرے مقدمہ میں اسلام سے قبل عرب کی سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی صورتِ حال، عرب کے قبائل، کعبۃ اللہ کی تاریخ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق اہم مباحث پیش کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا نسب، ولادت، رضاعت، بچپن، سفرِ شام، تجارت، نکاحِ حضرت خدیجہؓ، تعمیر کعبہ اور دیگر ابتدائی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ولادتِ نبوی ﷺ کے بیان میں شبلی کا ادیبانہ اسلوب خاص طور پر نمایاں ہے۔

اس کے بعد بعثت نبوی ﷺ سے ہجرت تک کے واقعات، پہلی وحی، دعوتِ اسلام، قریش کی مخالفت، قبولِ اسلام، مسلمانوں پر مظالم، ہجرتِ حبشہ، شعبِ ابی طالب، عام الحزن، سفرِ طائف، بیعتِ عقبہ اور دیگر اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

مدنی دور میں ہجرت، مدینہ منورہ میں قیام، مسجد نبوی کی تعمیر، مواخات، یہود سے معاہدات اور پھر غزوات و سرایا کا سال بہ سال ذکر ہے۔ بدر، احد، احزاب، حدیبیہ، خیبر، موتہ، فتح مکہ، حنین، طائف، تبوک اور حجۃ الوداع تک کے واقعات کے ساتھ ان کے تاریخی، معاشرتی اور تمدنی پہلو بھی واضح کیے گئے ہیں۔ آخر میں غزوات کے مجموعی مطالعہ سے اسلام کے اصولِ جنگ کی وضاحت کی گئی ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس جامعیت کے بارے میں لکھا ہے:

> ”ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے متعلق ہوں یا میدان جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اس طرح پیش کیا ہے جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور آپ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔“

(ماہنامہ معارف۔ سلیمان نمبر۔ ص/ ۱۸۱)

اس طرح پہلی جلد میں سیرتِ نبوی ﷺ کو محض واقعات کے مجموعہ کے طور پر نہیں بلکہ تاریخی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور دعوتی پہلوؤں کے جامع مطالعے کے

طور پر پیش کیا گیا ہے، اور متعدد مقامات پر مستشرقین کے اعتراضات کا بھی تحقیقی جواب دیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ

دوسرا حصہ نامکمل تھا، اس کی تکمیل کا فریضہ بھی ہونہار شاگرد نے انجام دیا۔ ذرا غور فرمایئے کہ استاد، جو علامہ دوراں تھا، اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں سیرت کی تالیف کا خاکہ بنایا تھا۔ شاگرد کا عہدِ شباب تھا۔ استاد نے آخری وقت میں شاگرد کا ہاتھ پکڑا اور آہ! سیرت کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ شاگرد کے لیے کس قدر مشکل تھا! وہ بھی نوجوان شاگرد، جو استاد کے خاکے میں رنگ بھرے، استاد کے مسودہ پر قلم رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جو نوٹ لگائے، وہ ایک مدت کے بعد لگائے۔

میں اکثر کہتا ہوں کہ علامہ شبلی کے دو شاہکار ہیں: ایک سیرت النبی، دوسرے سید سلیمان۔ آثار و باقیاتِ شبلی کو جو بقا و دوام حاصل ہوا، اس میں سید سلیمان ندویؒ کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ سیرت کی تکمیل، اس کی اشاعت، بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ شبلی کے قلم سے قلم ملانا کسی ریاضت سے کم نہیں، لیکن سلیمان نے یہ کر دکھایا، جب علامہ شبلی نے شعبہ سیرت قائم کیا تو سید صاحب کو بحیثیت باحث و محقق اپنے ساتھ رکھا اس طرح وہ شروع سے ہی استاد کے ساتھ اس کام میں شریک رہے، جب خود اس خاکہ میں رنگ بھرنا شروع کیا تو ان کی عمر محض ۲۹ تیس برس تھی، لیکن استاد کی تربیت نے کام آسان کر دیا، علامہ شبلی کے مجوزہ خاکہ کے دو پہلو تھے ایک یہ کہ پیغمبر کون تھا؟ دوسرے یہ کہ پیغمبر کیا لایا تھا؟ پہلے سوال کا مکمل و مدلل جواب علامہ نے خود ہی دیا اور دوسرے پہلو کو تفصیل کے ساتھ ہونہار شاگرد نے پایہ تکمیل تک پہنچایا، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیرت کا جو علمی پہلو ہے اس کو علامہ شبلی نے مکمل کیا جبکہ سیرت کے عملی پہلو کو جو رسول اللہ کے افعال و اقوال کی شکل میں کتب حدیث میں محفوظ تھا، اسے فنِ سیرت نگاری کے پیرایے میں ڈھال کر سید صاحب نے استاد کے خاکے میں رنگ بھرا اور سیرت النبی کے اس عظیم منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا، یعنی فلسفہ اسلام یا اسلامی تعلیمات کو سیرت نبوی کے آئینے میں پیش کرنے کا کام انجام دیا۔

بہرحال دوسرے حصے میں سید صاحب کے اضافوں کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> ”جلد دوم میں سید سلیمان ندوی نے اصل متن میں جو اضافے کئے ہیں وہ کتاب میں قیام امن، تبلیغ و اشاعت اسلام، تاسیس حکومت الٰہی کے عنوان کے تحت شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مذہبی انتظامات، تکمیل شریعت، عقائد، عبادات، معاملات اور حلال و حرام کے مباحث میں بھی سید صاحب نے معتد بہ اضافے کیے ہیں۔ سال آخر (۱۰ھ) سال وفات، متروکات اور شمائل نبوی وغیرہ میں سید صاحب نے کسی خاص اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن خطبات نبوی اور

عبادات نبوی کے ابواب مکمل طور پر اور معمولات نبوی اور مجالس نبوی کے ابواب کافی حد تک سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ ہیں۔ اخلاق نبوی کے طویل باب میں استاذ و شاگرد دونوں کا اشتراک ہے۔ البتہ آخری تینوں ابواب آنحضرت ﷺ کے ازواج و اولاد میں شاگرد نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔"

(اردو نثر میں سیرت رسولؐ۔ص/ ۵۵۸)

یوں دوسری جلد میں رسول اللہ ﷺ کی آخری زندگی، تکمیلِ شریعت، ریاستی و معاشرتی نظام اور آپ ﷺ کے معمولات و اخلاق کو یکجا کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سیرت النبی کے اس منصوبے میں تکمیل، تحقیق کا جو فریضہ سید صاحب نے انجام دیا ہے، وہ ایک منفرد کارنامہ ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ کی تالیف میں علامہ کی لگن

اس کام کی دھن علامہ پر ایسی سوار تھی کہ صحت کی خرابی، شدید نقاہت اور زندگی کے آخری ایام بھی ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکے۔ ان کا عزم تھا:

"سیرت کو جس طرح ہو گو جان دے کر پورا کرنا ہے۔"

اور آخری زمانہ میں بھی فرماتے تھے:

"ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک انکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔"

(مکاتیب شبلی۔ج،اول/ص۔ ۶۵)

یہ الفاظ اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ سیرت النبی ﷺ کی تالیف ان کے لیے محض تصنیفی مشغلہ نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ، احساسِ ذمہ داری اور علمی خدمت کا ایک عظیم منصوبہ تھی، اور یہی عشقِ رسول سیرت النبی کو دوسری تمام کتب سے ممتاز کرتی ہے، میں بلاخوفِ تردید کہتا ہوں کہ شبلی کی دو جلدوں میں محبت کی سوزش، عشق کی تپش اور حُبِّ رسول کی جو حلاوت ملتی ہے وہ سیرت کی کسی دوسری کتاب میں نہیں نظر آتی، اگر ایسی کوئی چیز اردو کی کسی اور کتاب میں کسی درجہ میں نظر آتی ہے تو وہ قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب ہے، شبلی نے عقیدتوں سے قلم کو دھویا، محبت کی روشنائی میں ڈبویا، دفاع اسلام کے جذبے سے سرشار ہو کر جب لکھنا شروع کیا تو سیرت جیسی علمی کتاب بھی فطری اسلوب نگارش میں ڈھل گئی، سطر سطر عشق و محبت، شیفتگی و وارفتگی کا مظہر بن گئی، خاکِ مدینہ کو سرمۂ اعتبار بنانے کا جذبہ صفحات پر بکھرتا چلا گیا، ذات نبوی سے وابستگی اس کتاب کا اصل پیغام بن گئی اور اس کی یہ خصوصیت بقیہ تمام خصوصیات پر غالب آ گئی۔

تالیف سیرت کے مقاصد و ضروریات

علامہ شبلی کے نزدیک سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف ایک دینی، علمی اور ملی فریضہ تھی۔ وہ اسے اپنی اولین ذمہ داری سمجھتے تھے:

''میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے نصیحت نبی کی خدمت انجام دیتا لیکن یہ ایک ایسا نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرات نہ کرسکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ ضرورتیں بڑھتی جارہی تھیں۔''(سیرت النبی مقدمہ/ص۔۵)

عصرِ حاضر میں سیرت کی ضرورت اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ مستشرقین نے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور اسلامی تعلیمات کو اعتراضات کا موضوع بنالیا تھا۔ علامہ نے اس ضرورت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''اگلے زمانے میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی دل میں کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن موجودہ زمانے کے معترضین کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کی اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن جب اقرار نبوت مذہب کا جزء ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وقت اور سفیر الٰہی تھا اس کے اخلاق عادات حالات کیا تھے یورپ کے محرفین آنحضرت ﷺ کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ ہر قسم کے معائب کا مرکب ہوتی ہے۔''(سیرت النبی مقدمہ/ص،۵)

علامہ کا مقصد ایسی جامع سیرت پیش کرنا تھا جس میں قرآن، حدیث، تاریخ اور جدید علمی ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کو علمی انداز میں پیش کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آ جائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآنِ مجید پر پوری نظر غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موضوع ہوگا وہ لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔''

(سیرت النبی مقدمہ/ص۔۶۲)

اسی طرح مستشرقین کی تصانیف کے تحقیقی مطالعہ کو بھی وہ ضروری سمجھتے تھے:

''سیرت نبوی جو زیر تصنیف ہے میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انہوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں نہایت غور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔''(سیرت النبی مقدمہ/ص ۶۲)

وہ سیرت کی ضرورت کو صرف مذہبی دائرے تک محدود نہیں سمجھتے تھے، بلکہ لکھتے ہیں:

''یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات

دینی و دنیوی ہے۔" (مقدمہ/ص۔۵)

چنانچہ ان کے نزدیک سیرت کا مقصد محض واقعات کی تدوین نہیں، بلکہ اخلاقی تربیت، علمی رہنمائی اور انسانی زندگی کی اصلاح بھی تھا۔ اسی عظیم مقصد کے تحت وہ آخری وقت تک تصنیف میں مصروف رہے، اور یہی وہ عظیم مقصد ہے جو سیرت النبی کو دیگر کتب سیرت سے ممتاز کرتا ہے۔

سیرۃ النبی ﷺ دیگر کتب سیرت سے کیوں ممتاز ہے؟

سیرت النبی ﷺ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے اور اسی وجہ سے یہ جہانِ سیرت کی دیگر کتب سیرت سے ممتاز ہے کہ اس میں سیرت کے واقعات محض نقل نہیں کیے گئے، بلکہ ان کی تحقیق، تنقید اور تجزیہ بھی کیا گیا۔ قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ کو بنیادی مصادر کے طور پر سامنے رکھا گیا بلکہ نصوص قرآنیہ کو خاص اور بنیادی حیثیت دی گئی، اور تاریخی روایات سے بھی تحقیق و تدقیق کے بعد استفادہ کیا گیا۔

علامہ شبلی نے قدیم عربی مصادر کے ساتھ جدید تاریخی و علمی لٹریچر سے فائدہ اٹھایا، مختلف روایات کے باہمی اختلافات کا جائزہ لیا اور دلائل کی روشنی میں زیادہ قابلِ اعتماد موقف اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اسی کے ساتھ عہدِ نبوی ﷺ کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کو بھی سیرت کے مطالعہ کا حصہ بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت النبی فقہ السیرہ کا بھی شاہکار بن گئی، عہد جدید میں علمی بیداری کے بعد بالخصوص عربی میں فقہ السیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، یعنی واقعات سیرت کی محض عرض و تقدیم پر اکتفا نہ کی گئی بلکہ ان کا تحلیل و تجزیہ کیا گیا اور دروس و عبر و نتائج اخذ کیے گئے، شبلی نے اس کی بنیاد بہت پہلے رکھ دی، واقعات سیرت کا تجزیہ، ان سے نتائج اخذ کرنا، سیرت کے علمی پہلو کو عملی پہلو سے مربوط کرنا اور عملی پہلو کو آئینہ سیرت میں پیش کرنا شبلی کا خاکہ تھا اور انھوں نے اس پر خود عمل کر کے دکھایا، عام طور پر محدثین نے مغازی، شمائل اور دلائل نبوت کو علحدہ کتب میں بیان کیا ہے، یہ سیرت کا علمی پہلو ہے اور اسی پر عام طور سیرت کا اطلاق کیا جاتا ہے، لیکن سیرت النبی کا امتیاز یہ ہے کہ شبلی نے دونوں پہلوؤں کو جمع کر کے نہ صرف کتاب کو انفرادیت عطا کی بلکہ اسے سیرت، تحقیق، فقہ السیرہ اور فلسفہ اسلام کا شاہکار بنا دیا۔

نقد استشراق

مستشرقین کے اعتراضات کا تحقیقی جواب بھی اس کتاب کا ایک بڑا نمایاں اور امتیازی ہے۔ شبلی کا مقصد سیرت نگاری کے لیے ایک نیا تحقیقی معیار قائم کرنا تھا۔ وہ اس کام کی دشواری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔" (مقدمہ/ص۔۶)

علامہ شبلی کے زمانہ میں مستشرقین کے اعتراضات کا

علمی جواب دینا ایک اہم ضرورت بن چکا تھا۔ انگریزی زبان میں مستشرقین کی تصانیف جدید تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچ رہی تھیں اور ان کے ذریعہ اسلام اور سیرتِ نبوی ﷺ کے بارے میں غلط تصورات پیدا ہو رہے تھے۔

علامہ نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور سیرت النبی ﷺ میں مستشرقین کے افکار، مصادر، طرزِ استدلال اور اعتراضات کا تحقیقی جائزہ لیا۔ ان کا منہج محض اعتراضات کا جواب دینا نہیں بلکہ ان کے بنیادی مصادر اور مقدمات کو بھی پرکھنا تھا۔

خصوصاً غزوات کے اسباب و محرکات کو واضح کر کے انہوں نے اس تصور کی تردید کی کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ اسی طرح جن روایات پر مستشرقین نے اعتراضات کی بنیاد رکھی، ان کے تاریخی، لغوی اور روایتی پہلوؤں کا جائزہ لے کر حقیقت واضح کی۔

شبلی کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا اندازِ نقد جذباتی یا محض مناظرانہ نہیں بلکہ تحقیقی اور استدلالی ہے۔ وہ بعض مقامات پر اعتراض کی بنیادی کمزوری واضح کر کے خود اس کی تردید کر دیتے ہیں۔ اسی ضمن میں وہ اصولِ روایت و درایت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کیا اس اہتمام و اعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبر اسلام میں سے کسی نے بھی اس جاں کاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟" (سیرت النبی مقدمہ/ص۔ ۵۸)

اس طرح شبلی نے استشراق کا جواب محض جذباتِ عقیدت کی بنیاد پر نہیں بلکہ تحقیق، تاریخی شعور، نقدِ روایت اور مضبوط استدلال کے ذریعہ دیا۔

سیرۃ النبی ﷺ اصولِ تاریخ و سیرت کی روشنی میں

علامہ شبلی نے سیرت نگاری کے لیے تحقیق، تنقید اور اصولِ روایت پر مبنی واضح منہج اختیار کیا۔ ان کے نزدیک کسی واقعہ کی تحقیق میں سب سے پہلے قرآن مجید، پھر صحیح احادیث اور اس کے بعد کتبِ سیرت و تاریخ کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ کتبِ سیرت کی روایات کو بلا تحقیق قبول کرنے کے بجائے ان کے اسناد و متون کو پرکھنا ضروری ہے۔ اختلاف کی صورت میں حدیث کی روایت کو ترجیح، واقعات کے اسباب و علل کی تلاش، مختلف روایات میں تطبیق اور عام عقل، مشاہدے اور مسلمہ اصولوں کے خلاف روایت کو ناقابلِ حجت سمجھنا بھی ان کے بنیادی اصولوں میں شامل تھا۔

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے ان اصولوں کو محض نظری طور پر بیان نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی برتا۔ مثلاً تحویل قبلہ جیسے واقعات میں قرآنی آیات کو بنیادی حیثیت دے کر تاریخی پس منظر اور اسباب کو واضح کیا گیا، پھر دیگر روایات سے مدد لی گئی۔

قصہ غرانیق جیسے حساس واقعات میں مختلف روایات

کے اختلاف، صحت اور تاریخی حیثیت کا جائزہ لیا گیا اور کمزور روایات سے استدلال کی کمزوری واضح کی گئی۔

قریش کی مخالفت، اسلام کی اشاعت، غزوات اور سرایا کی کثرت کے اسباب پر مستقل بحث کر کے واقعات کے پس منظر کو واضح کیا گیا۔ اس طرح غزوات کو محض جنگی واقعات کے طور پر نہیں بلکہ مخصوص حالات اور محرکات کے نتیجے کے طور پر پیش کیا گیا۔

بدر کے واقعات کے ساتھ مسلمانوں اور قریش کے باہمی حالات، قریش کی دشمنی اور اس مرحلے تک پہنچنے کے اسباب کو بھی سامنے رکھا گیا، قرآن مجید کے بیانیہ کو بنیادی حیثیت دی گئی اور اس طرح وہ موقف اختیار کیا گیا جس سے گرچہ بہت سارے اہل علم کو اختلاف ہے لیکن قرآن کے بیانیہ سے وہی زیادہ درست نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔

احد کے واقعہ میں صرف شکست و فتح بیان نہیں کی گئی بلکہ مسلمانوں کی داخلی کیفیت، اسبابِ شکست اور اس کے نتائج پر بھی توجہ دی گئی، جس سے علت و معلول کا اصول نمایاں ہوتا ہے۔

حدیبیہ کو محض ایک معاہدے کے طور پر نہیں بلکہ اس کے دوررس سیاسی اور دعوتی نتائج کے ساتھ دیکھا گیا، جس سے واقعات کے نتائج اور حکمتوں پر شبلی کی نظر واضح ہوتی ہے۔

فتح مکہ کے بیان میں سابقہ حالات، قریش کی عہد شکنی، صلح حدیبیہ کے پس منظر اور فتح کے بعد رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کو باہم مربوط کر کے پیش کیا گیا۔

اسلام کے پھیلاؤ کو صرف فتوحات سے وابستہ نہیں کیا گیا، بلکہ دعوت، اخلاق، معاشرتی اصلاح اور رسول اللہ ﷺ کے کردار کو بھی اس کا بنیادی ذریعہ قرار دیا گیا۔

شبلی نے بعض روایات کے فہم میں لغت، جغرافیہ، تاریخی حالات اور دیگر روایات سے مدد لی اور ایسی روایتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو مسلمہ تاریخی حقائق یا مضبوط قرائن سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

اس منہج کے بارے میں ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> ”جو مصنف کسی ایسے شخص کی سوانح عمری لکھ رہا ہو جو نہ صرف اس کا اپنا محبوب نظر ہو بلکہ کروڑوں انسانوں کی عقیدت کا مرکز ہو، اس کے حالات رقم کرتے وقت جوش و جذبہ کا مظاہرہ ہونا کوئی خلاف حقیقت بات نہیں ہے۔ پھر صاحبِ سوانح مذہبی شخصیت ہو تو اس کی سوانح سے مذہب کیسے خارج کیا جا سکے گا۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ عقیدت کے غلو میں کہیں سوانح نگار مذہبی اور اخلاقی جذبے سے مغلوب تو نہیں ہو گیا۔ سیرۃ النبی پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ ایسا نہیں ہوا۔“

(اردو نثر میں سیرت رسولؐ/ص۔ ۵۸۵)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شبلی نے تحقیقِ مصادر، نقدِ روایت، اسباب و علل کی تلاش، مختلف روایات میں تطبیق اور تاریخی قرائن کو اپنی سیرت نگاری کا بنیادی حصہ بنایا۔ اسی بنا پر اختر وقار عظیم نے لکھا ہے:

> ”آج تک سیرت النبی سے زیادہ محققانہ، عمدہ اور

جامع المعلومات کتاب رسول کریم ﷺ پر نہیں لکھی گئی۔"

(اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مؤرخ / ۱۲۳)

روایت و درایت کا اصول

شبلی کے نزدیک سیرت نگاری میں صرف روایات کو جمع کر دینا کافی نہیں، بلکہ روایت کے ساتھ درایت بھی ضروری ہے۔ یعنی روایت کی سند، راویوں کی حیثیت اور ماخذ کی صحت کے ساتھ اس کے متن، تاریخی قرائن، واقعات کے باہمی ربط اور عقلی امکان کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے۔ اسی اصول کے تحت انہوں نے سیرت کے واقعات کو محض منقولات کی حیثیت سے قبول نہیں کیا، بلکہ ان کی تحقیق و تنقید کی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں مختلف روایات میں تطبیق، ترجیح یا نقد سے کام لیا۔

شبلی پر نقد کی بنیادی وجہ

شبلی کے اسی طرزِ تحقیق پر بعد کے بعض اہلِ علم نے نقد بھی کیا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ شبلی نے بعض تاریخی روایات کے قبول و رد میں درایت، تاریخی قرائن اور عقلی استدلال کو زیادہ اہمیت دی، جب کہ بعض ناقدین کے نزدیک حدیثی روایت کے باب میں محدثین کے متعین کردہ اصولوں اور روایت کی سند کو مقدم رکھنا چاہیے تھا۔ چنانچہ شبلی کے منہج پر ہونے والی تنقید کو محض ان کی تحقیق سے اختلاف کے طور پر نہیں، بلکہ روایت و درایت کے باہمی تعلق اور سیرت نگاری میں ان کے دائرۂ کار کے اختلاف کے تناظر میں سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔

مقدمۂ سیرت النبی ﷺ کی خصوصیت روایت و درایت اور علامہ کا موقف

سیرۃ النبی ﷺ کا مقدمہ اپنی علمی وسعت، تحقیقی گہرائی اور اصولی مباحث کے اعتبار سے کتاب کا نہایت اہم حصہ ہے۔ یہ محض تمہیدی کلمات نہیں بلکہ فنِ سیرت نگاری کے اصول و مبادی پر ایک مستقل علمی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح علمِ حدیث میں امام بخاری و امام مسلم کے اصول اور مقدمات کو خاص اہمیت حاصل ہے، اسی طرح فنِ سیرت میں علامہ شبلی کا مقدمہ ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے "عالمانہ تنقید کا شاہکار" قرار دیا ہے۔

(فن سیرت نگاری پر ایک نظر سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد/ اپریل/ ۱۹۷۶ ص۔ ۳۸۰)

جبکہ ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں:

"سارے اسلامی ادب میں اس مقدمہ کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔"

(سید شاہ علی۔ اردو میں سوانح نگاری/ص۔ ۲۰۴)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے نزدیک:

"اس میں مصنف نے اپنی علمیت، ذہانت، وسیع مطالعہ، تنقیدی صلاحیت اور مورخانہ ژرف نگاہی سے ثابت کر دیا ہے کہ سیرتِ نبوی پر قلم اٹھانے کا حق انہی کا تھا۔"

(ضیاء الحسن فاروقی، اشخاص و افکار/ص۔ ۱۱۴)

علامہ نے مقدمہ میں سیرتِ نبوی ﷺ کی

تعریف، اس کی دینی و علمی اہمیت اور عصرِ حاضر میں اس کی ضرورت پر بحث کے بعد فنِ سیرت کی تاریخ اور ارتقا کا جائزہ لیا۔ متقدمین و متاخرین سیرت نگاروں اور ان کی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی کی اور یہ واضح کیا کہ مستند سیرت کی تدوین کے لیے قدیم ذخیرے سے کس طرح استفادہ اور کہاں تحقیق و تنقید ضروری ہے۔ خود لکھتے ہیں:

"سیرتِ نبوی کے متعلق قدماء نے جو ذخیرہ مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لیے اس ذخیرے سے کیوں کر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے"۔

(سیرت النبی مقدمہ/ص۔ ۹)

یہاں علامہ کا مقصد قدیم سیرت کے ذخیرے کو مسترد کرنا نہیں بلکہ اس کی تنقیح اور علمی جانچ پرکھ اور تحقیق کرنا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تاریخی امانت داری کا اعتراف کرتے ہوئے اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات غیر معمولی اہتمام اور احتیاط سے محفوظ کیے گئے، تاہم سیرت کی تمام روایات میں صحتِ روایت کے وہ معیار ہمیشہ ملحوظ نہیں رہے جو علمِ حدیث میں اختیار کیے گئے۔

اسی لیے شبلی نے روایت اور درایت دونوں کو اپنی سیرت نگاری کی بنیاد بنایا۔ روایت کا تقاضا معتبر مصادر سے واقعات حاصل کرنا ہے، جبکہ درایت اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ روایت کو سند و متن، تاریخی قرائن، عقلِ سلیم اور دیگر شواہد کی روشنی میں پرکھا جائے۔ چنانچہ محض کسی قدیم کتاب میں روایت کے موجود ہونے سے وہ اسے قابلِ قبول نہیں سمجھتے، بلکہ اس کی صحت اور تاریخی حیثیت کا جائزہ لینا ضروری قرار دیتے ہیں۔

علامہ نے کتبِ حدیث اور کتبِ سیرت کے فرق کو بھی واضح کیا اور ان کمزوریوں کی نشان دہی کی جن سے بعض سیرت نگار دوچار رہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے روایت و درایت کے اصول بیان کرتے ہوئے اپنی تصنیف کے لیے گیارہ اصول مقرر کیے، جن میں قرآنِ مجید، صحیح احادیث اور تاریخی روایات سے استفادہ، اسناد و متون کی تحقیق، مختلف روایات میں تطبیق، واقعات کے اسباب و علل کی تلاش اور تاریخی قرائن سے مدد لینا شامل ہے۔

مقدمہ میں یورپی اور مستشرقین کی تصانیف کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ علامہ نے ان کے مصادر، طرزِ استدلال، علمی کمزوریوں اور تعصّبات کو واضح کیا۔

مقدمۂ سیرت النبی ﷺ کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ شبلی نے روایت کو بنیاد اور درایت کو میزان بنایا۔ انہوں نے سیرت کے قدیم ذخیرے سے بھرپور استفادہ کیا، مگر اسے بلا تنقید قبول نہیں کیا؛ بلکہ تحقیق، تقابل، نقد اور تاریخی قرائن کی روشنی میں پرکھا۔ یہی متوازن منہج اس مقدمے کو فنِ سیرت نگاری میں ایک اہم علمی کارنامہ اور سیرۃ النبی ﷺ کی تحقیقی بنیاد بناتا ہے۔

نغمۂ شوق کی ایک داستان

(کلامِ ثاقبؔ کے پس منظر میں)

مولانا محمد سمعان خلیفہ بھٹکلی ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ۔بھٹکل)

شاعری انسان کے جذبات واحساسات کی ترجمان اور اس کی سوچ، فکر اور خیالات کی آئینہ دار ہوتی ہے، دلوں کی امنگ اور ذہنوں کی ترنگ پیکرِ الفاظ میں ڈھل کر لبِ اظہار پر آجاتی ہے اور نغمہ وآہنگ کا روپ دھار لیتی ہے۔ لہجوں کی کھنک، نغموں کی چمک اور آہنگ کی لہک سے پہلے دراصل سوزِ دروں کی تپش اور انفاسِ گرم کی خلش ہوتی ہے جو سرد انگیٹھیوں کو گرماتی بھی ہے اور نالۂ نے کو سرورِ مئے سے شادکام بھی کرتی ہے۔ ع

ورنہ فغانِ دل میں ہو پیدا سرورِ مئے کہاں

یوں تو دلِ گویا کے حامل زیادہ تر لبِ خاموش کے مالک ہوتے ہیں، مگر کبھی کبھی ان کا سوزِ دروں بے تاب ہوکر اور نالۂ دل بے قابو ہوکر صورتِ اشعار میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اس ساز سے وہ نغمہ پھوٹتا ہے جو بانگِ درا اور جرسِ کارواں کہلاتا ہے۔

شاعری کی فنی باریکیوں سے قطعِ نظر شاعر کے دل کی خلش اور اس کے جذبے کی تپش کے ساتھ وفورِ شوق اور مقصدیت کی روح اس کی شاعری کو ایک نئی جہت عطا کرتے ہیں، جہاں اس کی نے نوازی کے بہانے دل نوازی اور جاں گدازی کے جلوے بکھر کر رنگ ونور کی دنیا بساتے ہیں اور آہنگِ نفس سے غلغلہ اور ولولہ کی اٹھان ہوتی ہے اور کاروانِ شوق اور اربابِ وفا کے قافلوں کے لیے زادِ سفر ہاتھ آتا ہے۔

حضرت قاری صدیق احمد باندویؒ کا کلام ممکن ہے کہ فنی کمالات کے اعتبار سے اس طرح کی بلندی کا حامل نہ ہو یا بعض ناقدین کو اس میں قوافی کی چستی کی کمی محسوس ہو، مگر اتنا طے ہے کہ یہ دل سے نکلا ہوا کلام ہے، سوزِ دروں اس کا محرک اور شوق اس کا مرکب ہے، وہ ایک مصلح اور صاحبِ عزیمت داعی تھے اور دعوت واصلاح کا بے پناہ جذبہ ان کے دل میں موج زن تھا، اس لیے انھوں نے شاعری کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا اور اس میں بھی عام فہم اور سہل الفاظ کو ترجیح دی، دیکھیے کس طرح سے عام فہمی اور سہولتِ الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں:

کسی کی دعا کا اثر دیکھ آئے
مدینے کی شام و سحر دیکھ آئے

سوزِ دل اور جذبۂ دروں کی فراوانی کسی بھی شاعر کے دل کی آگ کو اس وقت اور بھڑکا دیتی ہے جب حکایت

اس کے محبوب کی اور ذکر اس کے کوچۂ پُرنور کا ہو، یہاں آکر فکر کی بالیدگی اور قلب ونظر کی شائستگی شوقِ فراواں اور جذبۂ بے پایاں میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اس کا اشہبِ قلم خوب جولانیاں دکھاتا اور فکر ونظر کی نئی دنیائیں سجاتا نظر آتا ہے، دل کی شکستگی ان دنیاؤں میں نئے رنگ بھرتی ہے اور زبان و بیان کے نئے شاہکار کینوس پر ابھرتے ہیں، مگر ان شاہکاروں کی قدر و قیمت اور ان کی تب وتاب الفاظ کے بے نور موتیوں کے بجائے ان کے فن کاروں کے دل کی شکستگی اور ان کی دردمندی سے لگائی جاتی ہے۔

نعت کی کائنات جس طرح ہمارے شعرا نے سجائی ہے اور اپنے کمالات کو ثریا کی بلندیوں سے ہم آغوش کیا ہے، اس کی نظیر دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں! ایک سیلِ رواں ہے شوق کا! ایک بحرِ بے کراں ہے جذباتِ عقیدت کا! ایک بے نظیر کائنات ہے فریفتگی اور وارفتگی، جنونِ شوق اور دیوانگی کے عناصر سے آباد کی ہوئی!

وفورِ شوق میں ہر جذبۂ دل میرے کام آیا
کبھی لب پر درود آیا کبھی لب پر سلام آیا

دیکھیے قاری صاحب کو بھی شہرِ شہریارِ جاں اور کوچۂ محبوبِ انس وجاں کیسا لگتا ہے۔

دیارِ پاک ہوتا اور خم ہوتی جبیں میری
وہاں کی رحمتوں سے زندگی ہوتی حسیں میری

اور سمندِ شوق کو مہمیز لگا کر کس طرح وہ مدینے پہنچ کر دم لینا چاہتے ہیں۔

تمنا ہے کہ گلزارِ مدینہ اب وطن ہوتا
وہاں کے گلشنوں میں کوئی اپنا بھی چمن ہوتا

فراقِ محبوب پر دل کی بے تابی اور بے کلی کا حال دیکھیے۔

مرا ان کے سوا نہیں کوئی
کسی کا ملجا ہوا کرے کوئی

بلکہ ان کی خواہش اور دل میں پوشیدہ امنگ دیکھیے کیا کچھ کہہ اٹھتی ہے۔

تمنا ہے کہ اب کوئی جگہ ایسی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے ہوتے یاد ان کی دل نشیں ہوتی

پھر یہ محبت زبانی جمع خرچی تک محدود نہیں ہے، بلکہ خاکِ مدینہ ان کی آنکھوں کا سرمہ ہے اور اتباعِ نبوی کے بغیر عشق ومحبت کا سفر نامکمل ہے۔

شہِ کونین کی سنت پہ جو عامل نہیں ہوتا
وہ کچھ بھی کر رہا ہو کچھ اسے حاصل نہیں ہوتا

اور ہاں، جس پر محبوب کی نظرِ کیمیا اثر پڑی اور جس کو اس کی صحبت کا شمہ مل گیا، اس سے بھی محبت کا عالم دیکھیے! محبوب کے یارانِ باصفا کا ذکرِ جمیل کس انداز میں کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کی کس طرح دعوت دیتے ہیں۔

اصحاب پیمبر دین کے اوپر جانیں قرباں کرتے ہیں
دین کے اوپر جان کا دینا سب کے بس کی بات نہیں

دلِ دردمند سے نکلنے والے اس نالے کی لے آپ خود سنیں اور اس ساز سے پھوٹنے والے نغمے کا سوز آپ خود محسوس کریں۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کا ادبی ذوق

'نگارشات' کے آئینہ میں

﴿ شاہ اجمل فاروق ندوی۔ نگران تحقیق انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، دہلی ﴾

''ایوب! ہم تو دونوں زندگی کے پلیٹ فارم پر منزلِ آخرت کی طرف لے جانے والی گاڑی کے منتظر تھے۔ تمھاری گاڑی پہلے آگئی اور تم چل دیے۔ میں ابھی پلیٹ فارم پر کھڑا ہوں، دیکھو کتنا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یوں سگنل ڈاؤن ہو چکا ہے، لائن کلیر ہے، اب تو سیٹی کی بھی آواز آرہی ہے۔ بہرحال تم تو آگے نکل گئے۔ میں پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔

ہماری راہ بھی منزل بہ منزل دیکھتے جانا''

یہ تھے وہ جملے جو استاد عالی مرتبت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے ٹھیک ایک سال پہلے اپنے بچپن کے دوست حکیم محمد ایوب اعظمی کی وفات پر جنوری ۲۰۰۵م میں تحریر فرمائے تھے۔ افسوس کہ منزلِ آخرت کی طرف لے جانے والی جس گاڑی کی آمد کو مولانا نے محسوس کرلیا تھا وہ آ پہنچی اور یکم جنوری ۲۰۰۶م کو مولانا سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ عیسوی سال کے پہلے دن شام کے وقت جدہ میں یہ حادثہ پیش آیا اور اسی رات حرمِ مکّی میں لاکھوں عازمین حج کی موجودگی میں نماز جنازہ ادا کر کے آپ کو جنت المعلیٰ کے اندر جوارِ صحابہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکاروگے ہم نہ بولیں گے

علماء و اہل مدارس سے ادب و انشا پردازی کی توقع بہت کم کی جاتی ہے بلکہ بسا اوقات تو ان پر قاتلِ ادب ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اپنی شگفتہ و شائستہ تحریروں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ ان الزامات کو دھویا ہے بلکہ علمی و ادبی دنیا میں اپنی اچھوتی زبان دانی کا لوہا بھی منوایا ہے۔ مولانا نے سیرت، ادبِ عربی، لسانیات، فقہ اور منطق کے موضوع پر تقریباً ۲۰/ انتہائی معتبر و مستند کتابیں تصنیف فرمائیں۔ مولانا کی ان گراں قدر تصانیف میں ایک اہم نام 'نگارشات' کا بھی ہے۔ یہ کتاب اصل میں ۳۳۱/ صفحات پر مشتمل مولانا کا مجموعۂ مضامین ہے۔ جس کو پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے ترتیب دے کر پروفیسر وصی احمد صدیقی کے مقدمے کے ساتھ مجلسِ علمی نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔ کتاب میں ۲۷/ مضامین اور ۱۸/

اداریے ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جو قلم کار اپنی تحریروں میں خالص علمی انداز اختیار کرتے ہیں، ان کے ہاں خشکی اور روکھا پن پیدا ہوجاتا ہے اور پڑھنے والے کے لیے چند صفحات سے زیادہ پڑھنا ممکن نہیں رہ جاتا بلکہ بسا اوقات تو چند سطور کا پڑھنا بھی بھاری ہوجاتا ہے۔اس کے برعکس وہ مصنّفین جن کا اندازِ بیان خالص ادبی ہوتا ہے وہ صرف الفاظ کے پیچ وخم ہی میں الجھے رہتے ہیں۔ اس طرح کی تحریریں قاری پر بار تو نہیں بنتیں، لیکن صفحات کے صفحات پڑھ جانے کے بعد بھی کوئی علمی نکتہ اس کی نظر سے نہیں گزرتا اور وہ بے چارہ بغیر کسی علمی فائدے کے لفظوں کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی کی دوسری تصانیف کی طرح 'نگارشات' کا بھی یہ امتیاز ہے کہ اس کا ہر مضمون علم وادب کا حسین سنگم ہے۔ زبان و بیان کی لطافت کی وجہ سے قاری کی دل چسپی بھی برقرار رہتی ہے اور ساتھ ساتھ علم کے بے شمار انمول موتی بھی قدم قدم پر اس کے ہاتھ آتے رہتے ہیں۔

کتاب کا پہلا مضمون ''جب مانگنے کا ڈھنگ دینے والا بتائے'' ہے۔ اس میں مولانا نے قرآن حکیم میں مذکور مختلف مواقع پر مختلف اشخاص کی زبانوں سے نکلی ہوئی دعاؤں کا مطالعہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان قرآنی دعاؤں کے الفاظ اگرچہ محاکات کے طور پر وارد ہوئے ہیں لیکن اس میں تعلیم کا پہلو بھی شامل ہے۔ دس صفحات پر مشتمل یہ پورا مضمون اور خاص طور پر سورۂ فاتحہ کے سلسلے میں کی گئی مولانا کی عالمانہ گفتگو اس بات کی مستحق ہے کہ اس کو ہر مسلمان پڑھے اور بار بار پڑھے۔ ناممکن ہے کہ ایک مسلمان جس کے دل میں ایمان کی ادنیٰ سی رمق بھی باقی ہو، وہ اس مضمون کو پڑھے اور اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور اس سے مکمل تسلیم ورضا کے ساتھ مانگنے پر اس کا دل آمادہ نہ ہو۔ مضمون کے اختتام پر قرآن حکیم کی آیت کریمہ اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات إلی النور (اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور کفار کے ساتھی شیاطین ہیں (انسان ہوں یا جنات) وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔) کی دل نشین اور فاضلانہ تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ولی کا ترجمہ ساتھی، سرپرست، پشت پناہ جو چاہے کر لیجیے، اس نام کے سنتے ہی بندہ کی آس بندھ جاتی ہے کہ اس جہان میں میرا کارساز وہی ہے، پھر تنبیہ بھی کرائی گئی کہ اس کی پشت پناہی یا سرپرستی حاصل کرنے کے لیے ایمان ضروری ہے اور ایمان ہی نور ہے۔ کفر کی ہزاروں قسمیں ہیں، سب تاریکیاں ہیں۔''

سیرتِ نبوی میں معراج کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر دور میں اس موضوع پر علماء ومحققین کے دو گروہ رہے ہیں۔ ایک گروہ کا ماننا یہ ہے کہ شبِ معراج

میں صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو معراج ہوئی تھی جب کہ جمہور کا ماننا یہ ہے کہ اس واقعے کو صرف روح تک مقید کرنا غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معراج میں روح کے ساتھ جسم مبارک بھی شامل تھا۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے ''اسریٰ و معراج'' کے عنوان سے اپنے دس صفحاتی مضمون میں اس واقعے پر بھی بحث کی ہے۔ حافظ ابن قیم، شاہ ولی اللہ دہلوی، علامہ سید سلیمان ندوی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری جیسے مشاہیر کی آرا نقل کرتے ہوئے مولانا نے بھی جمہور کی حمایت کی ہے اور اپنے اس اہم مضمون کا اختتام ان سطور پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اور یہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رویا عین اریہا تو اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ حقیقت آشکار ہوگئی۔ جس کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی جو کچھ پیش آیا، تھا تو رویا ہی۔ کیسی رویا؟ ویسی رویا جیسی عالم خواب میں ہم دیکھا کرتے ہیں؟ نہیں: ''رویا عین'' ایسی رویا جس میں آنکھیں غافل نہیں ہوتیں، بیدار ہوتی ہیں۔ جو کچھ دیکھا جاتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہو۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ، لقد رایٰ من آیات ربہ الکبریٰ۔
(بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ بیشک دیکھے اس نے اپنے رب کے بڑے نمونے)
(النجم: ۱۷، ۱۸)''

یہ حادثہ صرف اسلامی تاریخ کے لیے نہیں بلکہ پوری تاریخِ انسانی کے لیے لائقِ صد ہزار ماتم ہے کہ وہ واحد قوم جس کے لیے حصولِ علم کو عبادتِ الٰہی کا درجہ دیا گیا وہ اپنے بلند مقام سے گرتے گرتے اس حد تک پہنچ گئی کہ جہالت و لاعلمی اس کا شعار بن گئی۔ نتیجتاً دنیا کی علمی قیادت ان اقوام کے ہاتھوں میں آ گئی جنھوں نے اس قومِ مسلم سے روشنی و رہنمائی حاصل کی تھی۔ 'نگارشات' میں ''اسلام اور علم'' کے موضوع پر وہ گراں قدر مقالہ بھی شامل ہے جو رابطۂ عالم اسلامی کے موسمِ ثقافی ۱۴۰۷ھ کے موقعے پر پیش کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پر کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں قرآن، حدیث اور تاریخِ اسلامی کی روشنی میں ''اسلام اور علم'' کی اہمیت کو اس طرح واضح کر دیا ہے کہ قاری اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ پاتا کہ علم اسلام اور امت مسلمہ کا جزو لاینفک اور اٹوٹ حصہ ہے۔ قرآن حکیم کی پہلی وحی 'اِقرأ' پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''حیات بخشنا اور علم دینا دونوں کا ایک ساتھ ذکر اور ایک ہی سلسلۂ بیان میں کہ اس مالکِ حقیقی کا نام لیجیے جس نے تخلیق اور تعلیم سے اپنے بندے (انسان) کو نوازا علم کی اہمیت بتا رہا ہے۔ نیز تاریخی لحاظ سے ان آیات کا وحی اول ہونا ثابت ہے جس میں کسی زمانے میں کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ معاندین یہود و نصاریٰ نے

بھی قرآن کریم کے ترجمے کیے اور سورتوں کی ترتیب باعتبار وحی قائم کی۔ وہ بھی مانتے ہیں کہ پہلی آیتیں جو آں حضرت ﷺ پر نازل ہوئیں وہ یہی آیتیں تھیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ لفظ ''اقرأ'' (پڑھیے) قبل نبوت اور بعد نبوت کے زمانوں کے درمیان حد بندی کی لائن ہے تو غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قبل نبوت کے زمانے کو جاہلیت (Ignorance) کا زمانہ کہا جاتا ہے۔''

بائیس صفحات پر مشتمل یہ مقالہ انتہائی جامع اور فکر انگیز ہے۔ اسے پڑھ کر بے ساختہ اقبال کے یہ اشعار یاد آتے ہیں:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھوں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

یہ مضمون اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کتابچے کی شکل میں الگ سے شائع کیا جائے۔ مختلف زبانوں میں منتقل کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں اور غیر مسلموں تک پہنچایا جائے تاکہ اپنے اس کو پڑھ کر تاب ناک ماضی کے آئینے میں تاریک حال کو دیکھیں اور روشن مستقبل کا عزم کر سکیں اور غیر، اسلام کو جہل سے جوڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، ۲۰ رویں صدی کے بے مثال نثر نگار، منفرد اسلوب کے حامل ادیب و انشا پرداز، ممتاز دانش ور اور جید عالمِ دین تھے۔ انھوں نے جب، جس موضوع کو ہاتھ لگایا اس کو نئی زندگی اور نیا مقام عطا کیا۔ اپنے گہر بار قلم سے 'اردو کی کہانی خود اس کی زبانی' مختصراً بیان کی تو پڑھنے والوں کو محسوس ہوا کہ اردو مجسم ان کے سامنے ہے اور اپنی آپ بیتی بیان کر رہی ہے۔ اپنی 'ذاتی ڈائری کے چند ورق' مولانا محمد علی جوہر کے نام کیے تو اس شان کے ساتھ کہ پڑھنے والا مولانا محمد علی سے ہزار اختلاف کے باوجود ان کی عظمت کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ 'معاصرین' کا ذکر چھیڑا تو حق معاصرت ادا کر دیا۔ 'بشریتِ انبیاء' پر گفتگو کی تو اس آسان مگر جامع انداز میں کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ ایک 'اعزازی ندوی' ہونے کے ناطے طلبۂ ندوہ سے مخاطب ہوئے تو ان کو ان کا حقیقی مقام یاد دلا کر حقیقی ندویت کو اپنانے کی دعوت دی اور بیسویں صدی کے عظیم عالم و مصلح مولانا اشرف علی تھانوی سے وابستہ اپنی یادوں کو منظم کیا تو ان کو حکیم الامت ثابت کر کے ہی دم لیا۔ غرض یہ کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا، ایک نئے انداز اور ایک الگ امتیاز و انفراد کے ساتھ لکھا۔ اسی طرح جب انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی تو یہاں بھی ان کی مذکورہ شان جوں کی توں باقی رہی اور اردو کی بے شمار تفاسیر کے باوجود تفسیر ماجدی پوری تفسیری دنیا میں اپنی جداگانہ حیثیت و انفرادیت بنانے میں کامیاب ہوئی۔ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اسی انفرادیت کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور

ثابت کیا ہے کہ تفسیر ماجدی اردو تفاسیر کے مجموعے میں محض ایک اضافہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی بہت سی انفرادی و جوہات کی بنا پر ایک ضرورت تھی جس کو مفسر دریابادی نے پورا کردیا۔ مولانا کا یہ مضمون تفسیر ماجدی جلد اول کے آخر میں ضمیمے کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس مضمون میں مولانا نے ترتیب وار ''تفسیر ماجدی کی انفرادیت'' کا ذکر کرتے ہوئے تفسیر ماجدی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ یہ تفسیر مفسر گر ہے۔ یعنی قدما کے اقوال خود ان کے اپنے الفاظ میں، محققین کی تازہ سے تازہ تحقیقات، ایک لفظ کے مختلف مفسرین کے ذریعے اختیار کیے گئے متعدد معانی، نحوی تراکیب کی الجھنوں کے حل، قلب کی سختی کو موم بنانے والے واقعات، پوری شرح و بسط کے ساتھ مقاماتِ قرآن اور حیواناتِ قرآن کا تذکرہ، یہ سب کا سب اگر کسی کو یکجا دیکھنا ہو تو تفسیر ماجدی میں مل جائے گا۔ اس تفسیر کا ایک پہلو خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

''اس تفسیر کی انفرادیت کا پانچواں رخ یہ ہے کہ قرآن کی عظمت کا تصور شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ کلامِ الٰہی کا جلال و جمال، اس کی معنویت، اثر انگیزی، آیات رحمت میں رحمت کا منظر، آیات غضب میں رونگٹے کھڑے کرنے والا جو انداز ہے اس کو دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے۔ بشر پھر بھی بشر ہے، اس کے کلام میں وہ زور کہاں آسکتا ہے جو اصل میں ہے، مگر اس کا کوئی شمہ، کوئی معمولی سے معمولی حصہ، اگر انسان اپنی زبان میں منتقل کرسکتا ہے تو اس کی نمائندگی تفسیر ماجدی کرتی ہے۔''

یہ مضمون جسے ہم تفسیر ماجدی کا جامع ترین جائزہ بھی کہہ سکتے ہیں ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے قلم سے مفسر دریابادی کو اس شان دار خراجِ عقیدت کے ساتھ اختتام تک پہنچتا ہے:

''حاصل یہ کہ تفسیر کا ہشت پہل نگینہ اپنی جامعیت، معنویت، لفظی محاسن اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے اور یہ کام جو دراصل بیسیوں تفسیروں کا عطر ہے مفسر دریابادی کو رازی، زمخشری، سیوطی، قرطبی، بیضاوی اور آلوسی کی طرح تادیر زندہ رکھے گا، یوں بقا و دوام صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے۔''

''عالم اسلام۔ حقائق اور جائزے'' کے عنوان سے پندرہ صفحات پر مشتمل مضمون بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں عالمِ اسلام کی حقیقی صورت حال اور خوش آئند امکانات کو پیش کیا گیا ہے۔ مولانا نے ملتِ اسلامیہ کے جغرافیہ، معدنیات کے ذخائر، عددی قوت اور زمینی وسعت کا بھرپور جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ عالمِ اسلام دنیا کی تیسری بڑی قوت (Third Force) ہے۔ اس مضمون کی سب سے اہم خاصیت یہ ہے کہ اس میں بیسوی صدی میں امت اسلامیہ پر گزرے ہوئے حوادث کے ترتیب وار تذکرے کے ساتھ از سرِ نو

اقدامات کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ بیسویں صدی میں عالمِ اسلام پر گزرے ہوئے سب سے سخت حادثے یعنی زوالِ خلافت کا تذکرہ اور اس پر مایوسی سے دور رہنے کی دعوت دیتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''بے شک مرکزیت ٹوٹ گئی مگر کیا اس کے معنی یہی ہیں کہ مرکزیت دوبارہ قائم نہیں ہوسکتی؟ یہ معنی کس نے بتائے؟ اگر کسی کی کوئی چیز اس سے چھین لی جائے تو کیا اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنی اس چیز کو فراموش کر کے چپ چاپ بیٹھ جائے؟ مسلمانوں کی مرکزیت ٹوٹی نہیں چھینی گئی ہے۔ فلسطین پہلے بھی مسلمانوں سے چھن گیا تھا مگر صلاح الدین ایوبی کی غیرت و حمیت نے بانوے سال کے بعد اس کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ اب اگر پھر چھینا گیا ہے تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا؟ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں وہ انسانی جذبے کی قدر و قیمت اور اس کی قوت سے بے خبر ہیں۔''

پھر اسی مضمون میں آگے چل کر اسلام کی عظمت پر گفتگو کرتے ہوئے بڑے زوردار انداز میں فرماتے ہیں:

''ہماری نظر میں اسلام خود ایک دولتِ مشترکہ ہے۔ انفرادیت اور اجتماعی نظم کا مجموعہ، اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کا حامل، روحانیت اور مادیت کا امتزاج، انسانیت کی وحدت کا اولین رہنما، نیک و بد اور حق و باطل کا فرقان اور افراط و تفریط کی دنیا میں اعتدال کی میزان۔''

یہ مضمون دانش وارانِ قوم اور ہر صاحبِ فکر و نظر کے مطالعے میں ضرور آنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ عالمِ اسلام کا حکمراں طبقہ اس مضمون کے مطالعے کا اصل مستحق اور حاجت مند ہے۔ کیوں کہ اس میں بیسویں صدی میں عالمِ اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں اور ان کے خطرناک اثرات و نتائج کا جائزہ لے کر عالمِ اسلام کی قوت و طاقت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ ایک باقاعدہ اسلامی وفاق کے قیام کا خاکہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

یورپ میں جب پاپائیت نے بربریت اور درندگی کی وحشت ناک تاریخ رقم کی اور انسانیت کو اپنے ظلم کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پیسنا شروع کر دیا تو اس ظلم و جور کے نتیجے میں مذہب بے زاری پیدا ہوئی اور وہیں سے سیکولرزم کا جنم ہوا۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی کی تاریخ پر گہری نگاہ تھی۔ لہٰذا ''سیکولرزم کی تاریخی حیثیت'' کے موضوع پر اپنے محققانہ مضمون کے آغاز میں سیکولرزم کی انتہائی مختصر مگر جامع تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سیکولرزم، مغربی امورِ سلطنت کا ایک سیاسی نظریہ ہے۔ مغربی سیاسی جوار بھاٹا کا ایک عملی اور منطقی نتیجہ۔ ایک منفی عمل کا منفی ردِ عمل، ایک انتہا کے عمل سے دوسری انتہا کا وجود۔''

پھر کچھ آگے بڑھ کر مزید فرماتے ہیں:

''پاپائی حکومت کی جگہ سیکولر حکومت نے لے لی۔اس کا سادہ ترجمہ لاپاپائی حکومت ہونا چاہیے تھا۔لیکن جب میرے ایک صاحبِ علم وفضل اور صاحبِ احترام بزرگ نے اس کا ترجمہ ''لادینی'' کیا تو مجھے اس کو تسلیم کرنے میں تامل ہوا تھا۔ مجھے گمان تھا کہ شاید وہ یورپ کی تاریخ سے واقف نہیں ہیں۔مگر جب مجھے ان خطوط اور چند حوالوں کی روشنی میں یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کو کہا گیا تو مجھے ان کی گہری نظر کا معترف اور قائل ہونا پڑا کہ ہمارے علمائے کرام سو فیصد درست اور صحیح ہیں اور میں سالہا سال کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس مذہب دشمن تصور کی منزل صرف فریب ذہنی اور فسادِ انسانی ہے،اس کے سوا کچھ نہیں۔''

کچھ اسی انداز کا حامل کتاب کا اگلا مضمون ''مستشرقین'' بھی ہے۔علم کے نام پر جہل کو عام کرنے کا یہ ذریعہ اسلام اور اس کی پاک تعلیمات کے خلاف ایک بڑے ہتھیار کے طور پر سامنے آیا۔اس مضمون میں استشراق کے چہرے سے تاریخ کی روشنی میں پردہ اٹھاتے ہوئے مولانا ایک جگہ غم وغصے کے ملے جلے لہجے کے ساتھ فرماتے ہیں:

''مسلمان جماعتیں ایک ایسی دعوت دیں جس میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں اور اصولی بات کہیں جس پر سب کا اتفاق ہو تو اسلام کے لیے اب بھی برگ و بار لانے کی گنجائش ہے۔مگر مشکل یہ ہے کہ ہر گروہ ایک خاص نظریہ کا حامل ہے۔اس کے نزدیک دین حق کا ایک ہی راستہ ہے جو اس نے اختیار کیا ہے۔یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوسرے کام کرنے والوں کی تحقیر کرے اور چاہتا ہے کہ سب اس ''صراط'' کو اختیار کریں جو اس کے نزدیک ''مستقیم'' ہے۔لہٰذا اسلام کی راہ میں سنگ گراں صرف اغیار کی سازش ہی نہیں بلکہ اپنوں کی بھی نوازش ہے۔''

''جہادِ افغانستان''، 'نگارشات' کا ایک انتہائی دل چسپ اور عبرت انگیز مضمون ہے۔یہ اصل میں مضمون نہیں، آپ بیتی یا داستان ہے۔اس مضمون کے تحت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی نے اپنے پاک افغان سرحد کے ایک دورے کی روداد بیان کی ہے۔رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ایک تعلیمی دورے پر مولانا جب وہاں پہنچے تو ہلالِ احمر کے بڑے کیمپ کی روداد عجیب دل کش انداز سے سناتے ہیں:

''یہاں سینوں پر نشان لیے ہوئے جوان بھی ہیں اور معصوم بچوں کے پھٹے ہوئے سر، شانوں سے اترے ہوئے بازو بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ایسے بوڑھے بھی نظر آئے جن کی آنکھیں حلقۂ چشم سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور ایسی لاشیں دیکھیں جن کو بغیر کفن کے اسی لباس میں جس میں شہید ہوئے

دفن کیا جارہا تھا۔ یہ وہ مجرم تھے جن کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے وطن میں آزاد زندگی گزارنا چاہتے تھے، اپنے دین کو سینوں سے لگائے ہوئے تھے، وہ غاصب حملہ آوروں کو بتارہے ہیں کہ ایمان کی طاقت آتش و آہن کی طاقت سے زیادہ ہے۔ آٹھواں سال ہے کہ پندرہ لاکھ جانیں قربان کرنے کے بعد بھی وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ وہ اپنی وادی اور اپنے کوہستان کو اذان کی آواز سے محروم کردیں۔ میں نے ''وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل'' اور ''مومن کی اذان'' کی حقیقت علامہ اقبال کے اشعار میں ضرور پڑھی تھی اور ایک شاعرانہ اندازِ بیان سمجھا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ واقعی اس دنیا میں اس انداز کی اذانیں سنی جاسکتی ہیں اور اللہ کی کبریائی و عظمت کا اعلان دشت و کہسار میں زلزلہ پیدا کرسکتا ہے۔ مگر اس کیمپ کے گردونواح میں یہ بھی دیکھ لیا۔''

پھر چند سطور کے بعد فرماتے ہیں:

''مغرب و عشا کی اذانیں سنیں، عجمی لہجے میں سادہ سی اذان، آواز میں کوئی زیر و بم نہیں، خوش الحانی کا کوئی شائبہ نہیں، مگر مؤذن کی ادا ہمیشہ یاد رہے گی کہ جس کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کان پر تھی اور دوسرا ہاتھ شانے سے لٹکی ہوئی بندوق کے قبضے پر تھا۔''

اسی مضمون کی مندرجہ ذیل سطریں بھی ملاحظہ کیجیے اور صاحبِ مضمون کے حق میں رحمت و مغفرت کی دعائیں کیجیے کہ جہادِ افغانستان کے خاتمے پر دوسرے خطرناک فتنوں کے ابھرنے کی نشان دہی بھی کررہے ہیں مگر امید و عزم کا دامن یہاں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ فرماتے ہیں:

''اب یہ جنگ ختم ہونے کے قریب ہے، آثار صبح نمایاں ہورہے ہیں۔ مگر جو جانیں قربان ہوچکیں ہیں وہ واپس نہیں آئیں گی اور جو بچے اور جوان مشنریوں اور شیعیت کے چنگل میں آگئے وہ زندہ لاشیں ہیں جن کے اندر سے اسلام کی روح نکل چکی ہوگی اور جن کو روسی اپنے ملک میں آزادی و جمہوریت کے نام پر ''غسل دماغی'' کا عمل کرکے واپس کرے گا، وہ ملک کی سالمیت کے لیے مستقل خطرہ اور ''پانچویں کالم'' کا کام کریں گے۔ ایک کش مکش جاری ہے، ایک کش مکش آئندہ پیدا ہوگی اور مسلمان ہر دور میں تازہ دم ہوکر اپنے تازہ اور گرم خون سے ملت کی کھیتی سرسبز و شاداب کرتے رہیں گے۔''

خلاصۂ کلام یہ کہ 'نگارشات' مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کے ان وقیع مضامین کا مجموعہ ہے جو بہ یک وقت سیرت و سوانح، تفسیر و حدیث اور تاریخ و حالاتِ حاضرہ کے تذکرے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور کسی غیر واقف کار کو مولانا کے البیلے اسلوب نگارش کا قائل کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی نعتیہ شاعری

'میزابِ رحمت' کے آئینے میں

﴿محترمہ ام ہانی بنت مولانا کمال اختر ندوی۔لکھنؤ﴾

نعت گوئی اردو ادب کی اہم ترین اصنافِ سخن میں سے ایک ہے، جس میں شاعر رسولِ اکرم ﷺ کی مدح وتوصیف بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت اور وارفتگی کا اظہار کرتا ہے۔نعت گوئی کا مفہوم بڑا وسیع اور نازک ہے۔ یہ صنف جتنی خوب صورت ہے، اتنی ہی نازک بھی ہے۔ شرعی حدود اور آدابِ نعت سے واقفیت کے بغیر اس صنف کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔فکر میں ذرا سی لغزش ہو تو نعت اپنے شرعی واعتقادی دائرے سے تجاوز کر سکتی ہے۔

نعتیہ شاعری کا آغاز عربی ادب میں عہدِ رسالت ہی سے ہوا اور بعد ازاں فارسی شاعری کی دنیا میں اسے خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر اردو شعرا نے بھی اسے اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ فارسی کے بعد نعتیہ شاعری کا سب سے وسیع، متنوع اور مؤثر سرمایہ اردو زبان میں ملتا ہے۔

عہدِ رسالت سے عہدِ جدید تک بے شمار شعرا نے نعت گوئی کی ہے۔عہدِ رسالت میں حضرت حسان بن ثابتؓ نے نعتیہ شاعری کو ایک نمایاں اور مؤثر اسلوب عطا کیا۔ وہ شاعرِ رسول کے لقب سے معروف ہوئے اور رسولِ اکرم ﷺ ان کے اشعار کو پسند فرماتے تھے۔ان کا یہ مشہور شعر نعت گوئی کی بہترین عکاسی کرتا ہے:

واحسن منک لم ترَ قطُّ عینی
واجمل منک لم تلدِ النساءُ
خلقتَ مبرَّءًا من کلِّ عیبٍ
کانک قد خلقتَ کما تشاءُ

یعنی: ''میری آنکھوں نے آپ ﷺ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا اور نہ کسی عورت نے آپ ﷺ سے زیادہ خوب صورت بچہ جنا۔ آپ ﷺ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے، گویا آپ ﷺ ویسے ہی پیدا کیے گئے جیسے آپ چاہتے تھے۔''

بعد ازاں حضرت کعب بن زہیرؓ نے اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش کیا، جس کے صلے میں رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی چادرِ مبارک عنایت فرمائی۔ ان کے قصیدے نے نعتیہ شاعری کی روایت پر گہرا اثر ڈالا اور بعد کے شعرا نے اس اسلوب سے استفادہ کیا۔

اس کے بعد نعت گوئی کا یہ سلسلہ برابر قائم رہا اور آج تک جاری ہے۔ اردو کے تقریباً تمام بڑے شعرا نے دیگر اصنافِ سخن میں امتیازی مقام رکھنے کے ساتھ نعت

گوئی کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ غالب ہوں یا مومن، امیر مینائی ہوں یا داغ دہلوی، شبلی ہوں یا حالی، اور بعد کے شعرا میں اقبال، جگر، فانی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، اقبال سہیل اور اختر شیرانی سب نے اپنے اپنے انداز میں رسولِ اکرم ﷺ سے محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے شعرا نے اس میدان میں طبع آزمائی کی۔ کسی نے افراط سے کام لیا، کسی نے تفریط سے؛ کچھ شعرا نے طویل نعتیں لکھیں، کچھ نے مختصر، اور بعض نے اپنے خوب صورت اور دل کش کلام سے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ انہی میں ایک ایسی شخصیت بھی ہیں جن کی نعتیں نہ صرف دلوں کو چھو لینے والی ہیں بلکہ سادگی میں گہرے سوز و گداز اور حبِ رسول ﷺ کا بہترین نمونہ بھی پیش کرتی ہیں۔ یہ شخصیت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی ہے۔

مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی شاعری میں دل کشی و رعنائی بھی ہے اور سلاست و روانی بھی، مضامین کی بلندی بھی ہے اور اثر پذیری و دل نوازی بھی۔ مولانا نے اپنی نعتوں میں روایتی اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے فکری گہرائی اور معنوی وسعت پیدا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام دل پر اثر کرتا ہے اور قاری کو محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ اعمالِ صالحہ کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔

گویا ان کی نعتیں محض عشقِ نبی ﷺ میں ڈوبی ہوئی ایک صدا نہیں، بلکہ عوام کو حبِ رسول ﷺ کی دعوت دینے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہیں۔

مولانا کی نعتیہ شاعری کی سب سے نمایاں خوبی سوز و گداز اور عاجزی ہے۔ وہ جس سادگی سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، وہ ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ مثال کے طور پر ان کا مشہور کلام ملاحظہ ہو۔

خاک کا یہ ذرہ ذکرِ مہوشاں کیسے کرے
عشق کے رازِ نہاں کو وہ عیاں کیسے کرے
مدحِ آقا کی گدائے بے نشاں کیسے کرے
مشک سے دھوئے زباں کو پھر بیاں ایسے کرے

یہ ان کی عاجزی کی انتہا ہے کہ وہ خود کو رسولِ اکرم ﷺ کی ثنا کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ اس نعت کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی رسمی شاعر کا کلام نہیں، بلکہ ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ کے دل کی آواز ہے۔ اس نعت میں فارسی کے اشعار بھی شامل ہیں، جس سے اس کی ادبی خوب صورتی مزید بڑھ گئی ہے۔

نعتیہ شاعری کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں محبت و عقیدت کے ساتھ اعتدال اور شرعی حدود کی رعایت بھی ضروری ہے۔ بعض شعرا نے نعت میں غلو اور مبالغے کی ایسی راہ اختیار کی جو شرعی حدود سے متجاوز دکھائی دیتی ہے، جب کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی ذاتِ گرامی کے بارے میں غلو سے منع فرمایا اور اپنی بشریت کو واضح کیا۔ مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ نے اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

چونکہ وہ دین کا گہرا علم رکھتے تھے، اس لیے ان کے کلام میں شرعی حدود کی پاس داری نمایاں نظر آتی ہے۔ محبت کے غلبے میں بھی وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں

چھوڑتے۔ان کی شاعری قرآن وسنت کے تصورِ رسالت کے عین مطابق نظر آتی ہے۔ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کرتا ہوں تیری ذات پہ میں جان کو قرباں
ہے تجھ پہ فدا دل میری امی و ابی کا
دنیا میں تیرے نام کا شہرہ ہے ہر اک سمت
ہر ایک ہے شاہد تیری عالی نسبی کا

ان اشعار میں محبت کی شدت بھی ہے، عقیدت کی وارفتگی بھی اور اسلوب میں ایسا اعتدال بھی جو نعتیہ شاعری کے بنیادی تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

مولانا کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تصوف کا رنگ جا بجا نظر آتا ہے۔تاہم ان کے یہاں تصوف کسی پیچیدہ نظری بحث کی صورت میں نہیں، بلکہ محبت، عقیدت، عاجزی، روحانی وارفتگی اور قلبی تجربے کے ذریعے سامنے آتا ہے۔یہی کیفیت ان کی نعتوں کو محض شعری اظہار کے بجائے ایک روحانی تجربے کا آئینہ بنا دیتی ہے۔

ان کے یہاں روایتی استعارات کے ساتھ ساتھ جدید اور اچھوتے اندازِ بیان بھی ملتے ہیں، جو قاری کے دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔نعتیہ شاعری میں تخیل، فکر اور فن اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر جذبے کی طہارت اور خلوص کی شدت مطلوب ہے۔مولانا کی نعتیں اس حقیقت کی بہترین عکاس ہیں کہ ان میں مصنوعی جذبات کے بجائے قلبی احساسات اور سچی عقیدت کا اظہار ملتا ہے، جو کلام کو اثر انگیز بنا دیتا ہے۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، محبوبِ سبحانی
جلائی کفر کی ظلمت میں جس نے شمعِ ایمانی
جو اونٹوں کو چراتے تھے، انہیں بخشی جہاں بانی
عطا شاہوں کو درویشی کی، درویشوں کو سلطانی
سلام اس پر جو بن کر صاحبِ عزم و یقیں آیا
سلام اس پر جو بن کر رحمۃً للعالمیں آیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

نبی کے عشق میں مضمر سکونِ دل کا ساماں ہے
محبت ان سے کرنا جان و دل سے عین ایماں ہے
انہی کی زلف کی خوشبو پہ ہے مشکِ ختن قرباں
جبین پاک و روشن پر تصدق ماہِ تاباں ہے

یہ تو ان کے نعتیہ کلام کے چند نمونے ہیں۔ان کا پورا مجموعہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شیدائے رسول ﷺ کس طرح اپنی مخصوص لے، اپنے منفرد انداز اور عشق و محبت کی کیفیت میں نعتیہ کلام پیش کرتا ہے۔ان کے کلام میں ایسا سوز اور جذبہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ سے عقیدت رکھنے والا قاری اس کی گرمی اور تاثیر کو بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے۔

مولانا کی زبان سادہ، شستہ، رواں اور ادبی حسن سے آراستہ ہے۔انہوں نے پیچیدہ اور مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہوئے آسان اور عام فہم انداز اختیار کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شاعری کو خواص و عوام، دونوں حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

نمونے کے طور پر والہانہ محبت سے سرشار ایک سلام کا بند ملاحظہ ہو، جو راقمہ کے پسندیدہ سلاموں میں سے ایک ہے:

وہ خدا کا نبی، خاتم المرسلیں
مطلعِ نور تھی جس کی روشن جبیں
ذات ایسی ملے گی بتاؤ کہیں
ہو جو اتنی عظیم و وجیہ و حسیں
جس کی ہر بزم، جس کے سبو، جس کے جام
اس پہ لاکھوں درود، اس پہ لاکھوں سلام
وہ رسولوں میں آخر جو مرسل ہوا
جس پہ قرآن سارا منزل ہوا
جس کی ہر بات و جملہ مدلل ہوا
دین اسلام جس پر مکمل ہوا
جس کی ہر ہر ادا واجب الاحترام
اس پہ لاکھوں درود، اس پہ لاکھوں سلام

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کا نعتیہ کلام عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا وہ چشمہ ہے جو سیدھا قاری کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ ان کے نعتیہ مجموعے ''میزابِ رحمت'' میں محبت رسول ﷺ، سوز و گداز، عاجزی، فکری گہرائی، سادگی اور شرعی اعتدال کی حسین آمیزش نظر آتی ہے۔

''میزابِ رحمت'' اسی سلسلۂ عشقِ رسول ﷺ کی ایک اہم اور قابلِ قدر کڑی ہے۔ مولانا کا کلام نہ صرف ان کے قلبی جذبات اور محبتِ رسول ﷺ کا آئینہ دار ہے، بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک ایسا شعری سرمایہ ہے جس سے وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کر سکتی ہیں۔

یقیناً مولانا محمد ثانی حسنی ندویؒ کی نعتیہ شاعری اردو نعتیہ ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ ان کے اشعار محبتِ رسول ﷺ کی شمع کو روشن رکھنے اور دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی حرارت پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے۔

مرے دل میں تو ہی تو ہو

﴿مولانا محمد ثانی حسنیؒ﴾

مجھے زندگی میں یارب، سرِ بندگی عطا کر
دل کی بے حسی کو، غمِ عاشقی عطا کر
ترے درد کی چمک ہو، تری یاد کی کسک ہو
مرے دل کی دھڑکنوں کو نئی بے کلی عطا کر
جو تجھی سے لو لگاوے، جو مجھے میرا پتا دے
مرے عہد کی زباں میں، مجھے گمرہی عطا کر
میں سفر میں سو نہ جاؤں، میں یہیں کھو نہ جاؤں
مجھے ذوق و شوقِ منزل کی ہمائی عطا کر
بڑی دور ہے ابھی تک، رگِ جاں کی مسافت
جو دیا ہے قرب تو نے، تو شعور بھی عطا کر
بھری انجمن میں رہ کر نہ ہوں آشنا کسی سے
مجھے دوستوں کے جھرمٹ میں وہ بے کسی عطا کر
کہیں مجھ کو ڈس نہ جائیں، یہ اندھیرے بجلیوں کے
جو دلوں میں نور کر دے، وہی روشنی عطا کر
مجھے تیری جستجو ہو، مرے دل میں تو ہی تو ہو
مرے قلب کو وہ فیض درِ عارفی عطا کر

طوفان سے ساحل تک

محمد نفیس خان ندوی۔ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اسلام کی آواز صفا کی چوٹی سے بلند ہوئی، اس کی بازگشت مکہ کی گلیوں میں گونجی، اس کی صدا مردوں کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کی آواز خواتین کے دلوں پر دستک دیتی ہوئی ان کی روحوں میں سرایت کر گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کفر وشرک کے ایوانوں میں زلزلہ برپا ہوگیا اور باطل کے مضبوط دکھائی دینے والے قلعے تاش کے پتوں کی طرح بکھرنے لگے۔

وادیِ مکہ میں ابوسفیان کا نام پورے احترام سے لیا جاتا تھا۔ وہ قوم کا سردار اور مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ مسلمانوں کے خلاف سرگرم رہنا، انھیں اذیتیں دینا اور زدوکوب کرنا اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ لیکن مشیت الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا، وہ اسلام کے خلاف جتنا زیادہ سرگرم ہوتا گیا، اسی دوران اس کے اپنے گھرانے میں اسلام کا چراغ روشن ہوگیا۔ اس کی لاڈلی اور چہیتی بیٹی نے آبائی دین سے بغاوت کا فیصلہ کیا اور خود کو اسلام کے سپرد کر دیا۔ یوں مسلمانوں کی جماعت میں ام حبیبہ رملہؓ بنت ابی سفیان کا نام بھی شامل ہوگیا۔

ابوسفیان کی عزت خاک میں مل چکی تھی، اس کی سرداری کا شیش محل چکنا چور ہو چکا تھا اور اس کی غیرت و نخوت پاش پاش ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی انا پسند طبیعت کے لیے یہ کیسے گوارا ہوتا کہ وہ شکست تسلیم کر لے؟ ہار ماننا اس کی فطرت میں نہ تھا۔ چنانچہ اس نے رملہؓ پر سختیاں شروع کر دیں، مار پیٹ، چیخ وپکار اور آہ وبکا سے گھر کا ماحول سوگوار ہوگیا۔ آس پاس کے لوگوں کو بھی اس صورت حال کی خبر ہوگئی۔ مکہ کے مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں تیز کر دیں اور رملہؓ اور ان کے شوہر عبیداللہ بن جحشؓ بھی ظلم وستم کا نشانہ بننے لگے۔ پھر نت نئے مظالم کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لیے مکہ کی سرزمین تنگ ہوتی چلی گئی۔

ایسے سنگین حالات میں سرزمین حبشہ پر امید کی کرنیں نمودار ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے مسلمان خاموشی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تاکہ نجاشی کی پناہ میں امن وسکون کے ساتھ اپنے دین پر عمل کر سکیں۔ ان مہاجرین میں رملہؓ، ان کے شوہر اور ان کی معصوم بچی حبیبہ بھی شامل تھے۔

حبشہ پہنچ کر رملہؓ نے سکون کی سانس لی۔ اب نہ مکہ کے مشرکین کا خوف تھا، نہ وہاں کے مظالم کا سامنا، نہ گھر والوں کی دھمکیاں اور نہ محلے والوں کے طعنے، نہ نماز پڑھنے پر روک ٹوک تھی، نہ تلاوتِ قرآن پر

پابندی، اب نہ ایمان چھپانے کی ضرورت تھی اور نہ چھپ چھپ کر بندگی کرنے کی مجبوری۔ حالات بظاہر پُرسکون اور سازگار تھے، لیکن ----

لیکن رملہؓ کو کیا معلوم تھا کہ مشیت الٰہی نے ان کے لیے ایک اور ہی فیصلہ مقدر کر رکھا ہے۔ حالات اب اس سے بھی زیادہ سخت ہونے والے تھے۔ اب جسم کے بجائے روح پر ضرب لگنے والی تھی، ان کا وجود اندر سے ٹوٹنے والا تھا اور ان کی دنیا اجڑنے والی تھی۔ یہ پُرسکون فضا ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی اور ایک عظیم آزمائش ان کی منتظر تھی۔

جی ہاں! ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ ان کے شوہر عبیداللہ بن جحش عیسائیت سے متاثر ہو گئے۔ انھوں نے دین محمدی ﷺ کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی اور شراب نوشی میں مبتلا ہو گئے۔

شوہر کے عیسائیت اختیار کرنے کی خبر سن کر رملہؓ کے ہوش اڑ گئے۔ ان کی روح کانپ اٹھی اور ان کا وجود لرز اٹھا۔ شوہر کی وفات کا صدمہ بھی شاید اتنا گہرا نہ ہوتا، جتنا ان کے ارتداد نے ان کی دنیا اجاڑ دی تھی۔ سکھ دکھ میں ساتھ دینے والا، مشکل گھڑیوں میں ہاتھ تھامنے والا اور زندگی کے نشیب و فراز میں شریک رہنے والا شوہر اب ان سے دینی اعتبار سے جدا ہو چکا تھا۔

وہ انھیں سمجھاتی رہیں، منتیں کرتی رہیں، روتی اور گڑگڑاتی رہیں، انھیں آخرت کے انجام سے ڈراتی رہیں، لیکن کوئی بات کارگر نہ ہوئی۔ عبیداللہ بن جحش اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ شراب کے نشے میں ان کی زبان سے بے ربط باتیں نکلتی رہتیں۔ بالآخر انھوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا:

''رملہ! یا تو تم بھی نصرانیت قبول کر لو یا مجھ سے علیحدگی اختیار کر لو۔''

اجنبیوں کے اس شہر میں رملہؓ کا اپنا کوئی نہ تھا؟! ان کا واحد سہارا شوہر اور ان کی معصوم سی بچی تھی۔ شوہر کے ارتداد نے انھیں خون کے آنسو رلا دیے، لیکن ایمان کی قوت نے ان کے لڑکھڑاتے وجود کو سہارا دیا۔ ایمانی حرارت نے ان کی رگوں میں نیا جوش پیدا کر دیا۔ بے شک دنیا اجڑ چکی تھی، سارے ظاہری سہارے چھوٹ چکے تھے اور بیگانوں کی بستی میں کوئی شناسا نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات تو موجود تھی، تمام سہاروں کے چھن جانے کے باوجود اس کا سہارا باقی تھا۔ وہ اپنے بندے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔

اب رملہؓ کے سامنے تین راستے تھے: پہلا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی بات مان کر نصرانیت قبول کر لیتیں، لیکن شوہر کی بے پناہ محبت اور حالات کی تمام تر ستم ظریفی کے باوجود وہ اپنے دین سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ تھیں۔ ان کے نزدیک ایمان کی قیمت دنیا کے ہر رشتے اور ہر آسائش سے بڑھ کر تھی۔ ان کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے نوچ کر الگ کر دیا جاتا، تب بھی وہ اپنے رب کے دین سے بغاوت پر راضی نہ ہوتیں۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ واپس مکہ لوٹ جاتیں اور اپنے باپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیتیں۔ لیکن یہ راستہ بھی ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ مکہ اب بھی کفر و

شرک کا گڑھ تھا اور رملہؓ کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں کرسکتی تھیں کہ ان کے دین پر پابندیاں عائد کی جائیں اور انھیں ایک اللہ کی عبادت سے روکا جائے۔

تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ بے یار و مددگار، تنِ تنہا، حبشہ کی سرزمین پر ٹھہری رہتیں اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرتیں۔

رملہؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر جھکا دیا۔ اپنے شوہر کو الوداع کہا اور اپنی معصوم بچی کے ساتھ حبشہ ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب ان کے شب و روز اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے ذکر میں گزرنے لگے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کا رب اپنے بندوں سے غافل نہیں رہتا۔ وہ جب اپنے بندوں کو آزماتا ہے تو ان کے لیے اپنی رحمت وعنایت کے دروازے بھی کھولتا ہے۔ رملہؓ کو بھی اسی عنایت کے دن کا انتظار تھا۔

لیل ونہار کی گردش جاری رہی۔ دن گزرتے گئے اور راتیں ڈھلتی رہیں۔ رملہؓ کے زخم بھرنے لگے، ان کے باطن کا طوفان تھمنے لگا اور شوہر کی جدائی کا صدمہ رفتہ رفتہ برداشت کے قابل ہونے لگا۔ ابھی ان کی عدت کے ایام بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ان کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا اور ان کی دہلیز پر خوش نصیبی کا پیغام آپہنچا۔

اس دن کی صبح نہایت خوش گوار تھی، سورج کی روپہلی کرنوں نے زمین کو چاندی کا لباس پہنا دیا تھا، موسم دل کش تھا اور فضا میں ایک عجیب سی تازگی تھی، اچانک رملہؓ کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا تو سامنے نجاشی کی خاص خادمہ ابرہہ کھڑی تھی۔

ابرہہ کو دیکھ کر رملہؓ حیرت زدہ رہ گئیں۔ ابرہہ نے نہایت ادب اور خندہ پیشانی کے ساتھ شاہی آداب بجا لاتے ہوئے عرض کیا:

”بادشاہ سلامت نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے آپ کے ساتھ نکاح کا پیغام بھیجا ہے اور بادشاہ کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں اور بتائیں کہ آپ کس شخص کو اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتی ہیں۔“

رملہؓ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا، خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی، فرطِ جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ ان کے دامن میں دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمٹ آئی تھی؛ رسول اللہ ﷺ کی زوجیت کا شرف! یہ وہ اعزاز تھا جس کا تصور بھی ان کے لیے خوشی ومسرت کا ایک بے مثال لمحہ تھا۔

انھوں نے اپنے کنگن اتار کر ابرہہ کو دے دیے، پھر پازیب، کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں بھی پیش کردیں۔ گویا اس لمحے ان کے پاس دنیا کے سارے خزانے بھی ہوتے تو وہ انھیں ابرہہ کی نذر کردیتیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا:

”میں خالد بن سعید بن عاصؓ کو اپنا وکیل مقرر کرتی ہوں۔“

نجاشی کا شاہی محل ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ اس کے چاروں طرف درختوں کا سلسلہ تھا، جب کہ نشیب میں واقع حبشہ کا ایک خوب صورت باغ اس کے حسن کو دوبالا کررہا تھا،

محل کا عالیشان ہال نفیس نقش ونگار سے آراستہ تھا، چاروں طرف پیتل کے سنہرے اور چمک دار چراغوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور فرش پر قیمتی قالین بچھے تھے۔

حبشہ میں مقیم صحابۂ کرامؓ اس مجلس میں حاضر ہوئے، نکاح کی ایک سادہ مگر پُروقار مجلس منعقد ہوئی۔ وکیلوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی کارروائی مکمل ہوئی، اس طرح ایک بے سہارا، پریشان حال اور شکستہ خاطر خاتون پر کرمِ الٰہی کی ایسی نوازش ہوئی کہ وہ ''ام المؤمنین'' کے عظیم منصب سے سرفراز ہوگئیں۔

وہ رملہؓ، جو کبھی مکہ میں اپنے ہی گھرانے کی مخالفت کا سامنا کررہی تھیں، جنھوں نے حبشہ کی سرزمین پر شوہر کی جدائی کا صدمہ برداشت کیا اور جنھوں نے ایمان کی خاطر اپنے ہر سہارے کو قربان کردیا، آج رسول اللہ ﷺ کی زوجیت کے شرف سے مشرف ہوچکی تھیں۔

یہی ایمان کی قوت ہے اور یہی صبر واستقامت کا صلہ! انسان جب آزمائشوں کے طوفان میں بھی اپنے ایمان کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایسے راستے کھول دیتا ہے جن کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا کی زندگی کا یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایمان کی راہ میں آنے والی مشکلات، محرومیاں اور قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ طوفان کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید وابستہ رکھنے والا بالآخر ساحل عافیت تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ (رضی اللہ عنہا وأرضاھا)

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو

﴿مؤمن خان مؤمنؔ﴾

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بو الہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے میں ہوس حور سے گزرا
اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعی عاشق جاں باز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دز دیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکی دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسف بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومنؔ نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

باسمہ تعالی

مکرمی ومحترمی جناب ---------- زیدلطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ہمیں آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے کہ **رابطہ ادب اسلامی** کا دوروزہ سالانہ (۴۲واں) کل ہند مذاکرۂ علمی ملک کی ممتاز وموقر اکیڈمی "مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل" کے زیر اہتمام۔ان شاء اللہ۔ بتاریخ ۴-۵/جمادی الثانیہ ۱۴۴۸ھ مطابق ۱۴-۱۵/نومبر ۲۰۲۶ء (شنبہ-یکشنبہ) منعقد ہوگا، جس کا موضوع ہے:

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کی ادبی، علمی اور فکری خدمات

مذاکرۂ علمی کی صدارت حسبِ معمول صدر رابطہ ادب اسلامی جناب حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (مدظلہ العالی) فرمائیں گے اور مجلسِ استقبالیہ کے صدر جناب مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، سکریٹری مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل ہوں گے۔ مذاکرۂ علمی میں آپ کی شرکت ہمارے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔

مقالہ نگار حضرات اپنی شرکت کے ارادے اور مقالے کے عنوان سے ۱۵/اکتوبر ۲۰۲۶ء تک مطلع کرنے کی زحمت فرمائیں اور یکم/نومبر ۲۰۲۶ء تک اپنا مقالہ کمپوز کرکے (PDF اور Inpage) فائل کی شکل میں بذریعہ ایمیل اور واٹس ایپ ارسال فرمادیں تاکہ مقالات کی ترتیب وتنسیق میں سہولت ہو۔ سہولت کے لیے بطور نمونہ چند ذیلی عناوین کی فہرست منسلک ہے۔

مذاکرۂ علمی کے دوران قیام وطعام کی ذمہ داری منتظمین کی ہوگی۔

والسلام

مخلص

عمیر الصدیق ندوی

(سکریٹری رابطہ ادب اسلامی)

مقامِ انعقاد کا پتہ

مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی

Maulana Abul Hasan Ali Nadvi Islamic Academy

Jamia Abad Road, PO. Box No. 30. BHATKAL- 581320, Karnataka,

(India) Mob. & WhatsApp: 9620104757

E-mail: nadviacademy@hotmail.com

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ)

اور ان کی ادبی، علمی اور فکری خدمات

ذیلی عناوین

۱۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ ۔ فکر اسلامی کے نقیب

۲۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اور عربی زبان وادب

۳۔حقیقی صحافت کے اصول وضوابط۔مولانا کے نظریات کی روشنی میں

۴۔جدید عربی ادب اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کے نظریات

۵۔اسلامی صحافت کے اصول وآداب ۔ مولانا سید واضح رشید کی نظر میں

۶۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی شخصیت کے ترکیبی عناصر

۷۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی محسن شخصیات

۸۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کے اپنے رفقاء سے تعلقات

۹۔مولانا سید رابع حسنی ندوی اور مولانا سید واضح رشید حسنی کے باہمی روابط

۱۰۔بیسویں صدی کی اسلامی تحریکات مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی نظر میں

۱۱۔بیسویں صدی کی اسلامی شخصیات مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی نظر میں

۱۲۔مطالعۂ مفکر اسلام کے میدان میں مولانا سید واضح رشید کی تصانیف کی معنویت

۱۳۔’’مکاتیب واضح ‘‘۔ ایک مطالعہ

۱۴۔تحریکِ ادبِ اسلامی اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۱۵۔تحریکِ ندوہ کے استحکام میں مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کا حصہ

۱۶۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی ۔ ایک مثالی مربی

۱۷۔’’ محسنِ انسانیت ‘‘۔ ایک مطالعہ

۱۸۔مطالعۂ قرآنیات اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۱۹۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کا قرآنی ذوق

۲۰۔مطالعۂ تصنیفات اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۲۱۔مطالعۂ استشراق اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۲۲۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اور مغربی مفکرین

۲۳۔مولانا واضح رشید حسنی کی تحریروں میں انگریزی جرائد ورسائل سے استفادہ

۲۴۔عربی صحافت اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۲۵۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی ''ادب اہل القلوب'' کے تناظر میں

۲۶۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اور عالمی مسائل پر اُن کے بے لاگ تبصرے

۲۷۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اور ان کے محسن اساتذہ

۲۸۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اور عربی ریڈیائی ادب

۲۹۔اردو ادب کی باکمال ہستیاں مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کی نظر میں

۳۰۔فکری وسیاسی افکار ونظریات اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۳۱۔قضیۂ فلسطین اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۳۲۔تاریخ ادب عربی اور مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ

۳۳۔'' صور واوضاع ''۔ایک مطالعہ

۳۴۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی اپنے افکار وخدمات کے حوالے سے

۳۵۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ ۔ ایک مفکر اور دانشور

۳۶۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی ۔بحیثیت ادیب وماہر زبان

۳۷۔''الی نظام عالمی جدید'' ۔ ایک تفصیلی مطالعہ

۳۸۔'' الغزو الفکری'' ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

۳۹۔'' مصادر الادب العربی'' ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ

۴۰۔مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی کے تحریر کردہ پیش لفظ اور مقدمے۔ایک جائزہ

۴۱۔'' اعلام الادب العربی الحدیث'' ۔ ایک مطالعہ

۴۲۔''نظام تعلیم وتربیت (اندیشے،تقاضے اور حل) '' ایک جائزہ

KARWAN-E-ADAB

Lucknow







